شذرات

لال مسجد کا سانحہ	خورشید ندیم	۲
لال مسجد اور جنرل مشرف صاحب کا خطاب	″ ″	۵

قرآنیات

النساء (۴: ۵۸-۷۰)	جاوید احمد غامدی	۹

دین و دانش

ایمانیات (۱۸)	جاوید احمد غامدی	۱۷

نقطۂ نظر

علامہ جاوید احمد غامدی کا تصور ''فطرت''	حافظ محمد زبیر	۲۷

نقد و نظر

غامدی صاحب کے تصور 'فطرت' پر اعتراضات کا جائزہ	منظور الحسن	۴۷

مقامات

میرا نام	جاوید احمد غامدی	۸۳

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خورشید ندیم

لال مسجد کا سانحہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[لال مسجد کے سانحے پر ہر آنکھ اشک بار ہے۔ظلم و بربریت کے اس مظاہرے میں کس کا کتنا کردار ہے،اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا،لیکن جو کچھ سامنے آیا ہے،اس کی بنا پر ان لوگوں کی رائے زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد کرتے ہیں ــــ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس قوم کو ایسے حادثوں سے آیندہ محفوظ رکھے۔آمین۔

یہ جناب خورشید ندیم کے دو ''شذرات'' ہیں جو انھوں نے اس حادثے کے موقع پر تحریر کیے تھے۔ان میں انھوں نے اپنے زاویے سے اس حادثے پر تبصرہ کیا ہے۔اس واقعے کے بارے میں ان کی کسی رائے یا کسی تجزیے سے اختلاف ہو سکتا ہے،مگر اس کے پس منظر اور پیش منظر کے حوالے سے جو سوالات انھوں نے اٹھائے ہیں، وہ ہم سب کے لیے قابل غور ہیں۔

قارئین کے افادے کے لیے یہ شذرات یہاں شائع کیے جا رہے ہیں۔مدیر]

اس حادثے کا ہر پہلو میرے لیے تکدر اور اضطراب کا باعث ہے۔جواں سال طلبا اور طالبات کا یوں چپکے سے موت کی آغوش میں چلے جانا، میرے دل پر ایک قیامت ڈھا گیا۔نہیں معلوم ان میں کتنے ایسے تھے جو آنے والے وقت میں اللہ کی کتاب کے مفسر ہوتے اور زمانے کے سامنے اس آخری و ابدی الٰہی پیغام کے عجائب بے نقاب کرتے۔کیا معلوم جوانی میں مر جانے والی کتنی بچیاں اپنی جلیل القدر ماں، ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے نقوش قدم پر چلتے چلتے اقوال و افعال پیغمبر علیہ السلام کی شارح بنتیں۔کون جانتا ہے کہ یہ جواں مرگ مستقبل میں

مسند فقہ کی رونق ہوتے۔ میں ان نوجوانوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب جنازے میرے گھر سے اٹھے ہوں۔

میں ٹیلی وژن کی سکرین پر مولانا عبدالعزیز کا تمسخر اڑتے دیکھتا اور سنتا ہوں تو لگتا ہے جیسے کسی نے میرے باپ کو سر بازار رسوا کر دیا ہے۔ جو لوگ دینی شناخت کے ساتھ معاشرے میں جیتے ہیں، ان کی رسوائی ہمیشہ میرے لیے دل گرفتگی کا باعث بنی ہے۔ اسی طرح جب میں مذہبی سیاست دانوں کی اخلاقی پستی کے مظاہر دیکھتا ہوں تو اپنی ذات میں سمٹتا اور شرمندہ ہوتا رہتا ہوں۔ میں جب بھی کسی ایسے حادثے سے دوچار ہوتا ہوں تو مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ دین سے محبت کرنے والے یہ سوچیں کہ ایسی شرمندگی، ناکامی اور رسوائی ان کا مقدر کیوں بنتی ہے؟ آخر ملا عمر اور صدام حسین جیسے لوگ ہماری صفوں میں کیوں ہوتے ہیں۔ یہاں کسی کا اخلاص یا اخروی انجام زیر بحث نہیں ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کا علم صرف عالم الغیب کو ہے۔ ہمارے لیے تو صرف یہ سوال اہم ہے کہ جو لوگ دین کے نام پر مسلمانوں کی قیادت کے دعوے دار ہیں، ان کی حکمت عملی میں ہمیشہ شکست ہی کیوں لکھ دی گئی ہے؟

میرا خیال ہے کہ لال مسجد کے حادثے نے ہمیں ایک مرتبہ پھر انھی سوالات کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آج ہم نے اگر اس پر غور نہ کیا تو مستقبل میں مجھے اندیشہ ہے کہ یہ حادثے دہرائے جاتے رہیں گے۔ میں نے ان سوالات کو اپنا موضوع بنانے کی جسارت کی ہے۔ یہ تلخ نوائی اگر آنے والے دنوں میں ہمیں کسی ایسے ہی حادثے سے محفوظ رکھ سکے تو شاید مجھ سے زیادہ کوئی اس پر خوش نہ ہو۔

اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ دین کی اس تعبیر کا ماخذ کیا ہے جس نے مسلمان معاشروں کو آج انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے؟ مسلمان اہل علم ہر دور میں موجود رہے ہیں جو حق بات کو بیان کرتے رہے ہیں، لیکن ان کا وجود کبھی فتنے اور انتشار کا باعث نہیں بنا۔ خلافت راشدہ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے استثنا کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں رہا جس میں فی الواقع دینی تعلیمات کی حکمرانی ہو۔ اس کے باوجود مسلمان اہل علم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے مسلمانوں کی زندگی خطرے میں پڑی ہو۔ لال مسجد کے ذمہ داران کا تعلق فقہ حنفی سے ہے۔ اس فقہ کی مستند کتاب ''ہدایہ'' میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے: 'الامر بالمعروف بـاليد الى الامراء و باللسان الى غيرهم'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ یعنی طاقت کے ساتھ برائی کو روکنا اور معروف کو قائم کرنا حکمرانوں کا کام ہے اور جن کے پاس اقتدار نہیں ہے، ان کی ذمہ داری محض یہ ہے کہ وہ زبان کے ساتھ برائی سے روکیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تو یہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کے پاس ممنوعہ آلات موسیقی ہوں اور دوسرا مسلمان انھیں توڑ دے تو اسے تاوان دینا پڑے گا، کیونکہ اس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ جب فقہی روایت یہ کہتی ہے تو سوال یہ ہے کہ روایت پسندی کی شہرت رکھنے والے ان علما کے اس طرز عمل کا ماخذ کیا ہے جس کے تحت وہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کے لیے سرگرم ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ ریاست کے اندر ایک ریاست بنانے کو جائز سمجھتے ہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ہم اسلام کے نام پر مسلمان معاشروں کو انتشار اور فساد میں مبتلا کرتے ہیں تو اس کا فائدہ کسے ہوتا ہے؟ گزشتہ دنوں اسلام آباد میں جو کچھ ہوا اس کا اسلام اور مسلمانوں کو کتنا فائدہ ہوا؟ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمان حکمرانوں کا رویہ مثالی نہیں ہے، لیکن ان کو ہٹانے کے لیے مسلمان معاشروں کو مستقلاً اضطراب میں مبتلا رکھنا اسلام کی کون سی خدمت ہے؟ پاکستان میں اسلام کے نام پر مسلسل ایک تحریک برپا رہتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ عدم استحکام کا شکار رہے۔ یہاں نہ تو سیاسی اصلاحات ممکن رہی ہیں اور نہ ہی معاشی اصلاحات۔ حکمرانوں سے لے کر عامۃ الناس تک دین کی دعوت پہنچانا اور انھیں ان کی دینی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا یہاں کبھی ممنوع نہیں رہا۔ اس مقصد کے لیے تمام جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود اسلام کے نام پر عدم استحکام پھیلانے کا جواز کیا ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا اخلاقیات اور سیاست کا آپس میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا؟ لال مسجد کے ذمہ داران نے جو طرز عمل اختیار کیا، اسے شرعی، اخلاقی، آئینی یا عقلی، کسی اعتبار سے درست قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی اور صدمہ بھی کہ ہمارے بعض رہنما اس طرز عمل کی مذمت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم مجھے مولانا فضل الرحمٰن اس معاملے میں بہتر جگہ پر کھڑے نظر آئے۔ مولانا فضل الرحمٰن سے جب لال مسجد کے ذمہ داران کے بارے میں سوال ہوا تو انھوں نے اسے غلط کہا۔ انھوں نے حکومت کی بھی مذمت کی، لیکن لال مسجد والوں کا دفاع نہیں کیا۔ بعض نے کہا کہ اس کی ذمہ دار حکومت ہے اور بعض نے ارشاد فرمایا کہ یہ آپریشن امریکا کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک اخلاق و کردار کے اعتبار سے یہ بہترین لوگ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب معاشرے میں اس سطح کے لوگ بھی گروہی مفادات کی اسیری میں سچ کو سچ کہنے کے لیے تیار نہیں تو اس معاشرے کے مستقبل کے بارے میں نیک تمناؤں کا کیسے اظہار کیا جا سکتا ہے؟

مسلمانوں کو کئی عشروں سے جس زوال کا سامنا ہے، مسلمان رہنماؤں اور اہل علم نے اس کے تجزیے میں بالعموم دو باتیں کہی ہیں: ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی یہ حالت زار اغیار کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ دوسری یہ کہ ہماری زبوں حالی کا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اصل سبب ہمارے حکمران ہیں۔ اس تجزیے کے نتیجے میں جو حکمت عملی سامنے آئی ہے، اس کے تحت کبھی انگریزوں اور کبھی امریکا کے خلاف اعلان جہاد ہوا۔ مزید یہ کہ مسلمان معاشروں کے اندر اصلاح کی ہر کوشش کا دائرہ سیاست رہی۔ یعنی یہ کہ اگر مسلمانوں کا اقتدار صالح لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے تو تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ یہ تجزیہ غلط تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بنیاد پر جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکی۔ ہم نے غیروں کے خلاف اعلان جہاد کیا تو ہمارا معاشرہ سید احمد اور شاہ اسماعیل جیسے جلیل القدر لوگوں سے خالی ہو گیا۔ مسلمان حکمرانوں کے خلاف اقدام کیا تو لال مسجد جیسے حادثات ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اب ایک نئے تجزیے کو کسی حکمت عملی کی بنیاد بنایا جائے۔ اس تجزیے کے بھی بنیادی طور پر دو نکات ہیں: ایک یہ کہ ہماری اس حالت زار کے اسباب خارج میں نہیں، داخل میں ہیں۔ دوسرا یہ کہ اصلاح کا ہدف حکمران نہیں، عوام ہیں۔ اقتدار نہیں، سماج ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس زاویے سے درپیش مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمیں ان سوالات کے جوابات مل سکتے ہیں جو میں نے اس کالم میں اٹھائے ہیں۔ اس کے بعد امید ہے کہ دین کا کوئی عالم تمسخر کا نشانہ بنے گا اور نہ ہی معصوم لوگوں کا لہو رائگاں بہ جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لال مسجد اور جنرل مشرف صاحب کا خطاب

۱۰ جولائی کی شام کچھ اس طرح اتری کہ رنج والم کے سایے اس کی تاریکی میں اضافہ کر گئے۔ میری زندگی میں ایسے لمحات بہت کم آئے ہیں، جب غم اور غصہ یوں باہم مل گئے ہوں۔ غم کے اسباب تو واضح تھے تاہم اس کا تعین مشکل تھا کہ اس غصے کا مخاطب کون ہے۔ کوئی ایک یا وہ سب جنھوں نے اپنے نظریات، خیالات، طرز عمل، بے حسی یا پھر نا اہلی سے معصوم بچوں اور دین سے محبت رکھنے والوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ دو دن بعد جب میں نے ٹیلی وژن پر عبدالرشید غازی کو موت کی آغوش میں سوتے دیکھا تو یہ منظر اداسی میں اور اضافہ کر گیا۔ لال مسجد کے تناظر میں جنم لینے والے یہ مناظر، مدتوں اس قوم کی یادداشت سے محو نہ ہو سکیں گے۔ غم اور غصے کا یہ تاثر برسوں ان کا پیچھا کرے گا۔

اس حادثے کے بعد جنرل پرویز مشرف صاحب نے اپنے خطاب میں ہم سب کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی

دعوت دی ہے۔ جب وہ تقریر فرما رہے تھے تو گمان یہی ہے کہ انھوں نے ''ہم سب'' میں خود کو شامل کیا ہو گا، لیکن ان کے خطاب میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ البتہ، دوسروں کے گریبان میں جھانکنے کے بے شمار شواہد ضرور موجود تھے۔ یہی آج اس قوم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ہر ریاستی ادارہ، حکومت، علما و مذہبی سیاست دان اور قومی رہنما سب دوسروں کا احتساب کر رہے ہیں اور ''ہم سب'' سے خود کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔

آج خود احتسابی کا مطلب یہ ہے کہ ہر ریاستی ادارہ اور حکومت اس سوال پر غور کرے کہ اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے میں اس کا کیا کردار تھا۔ جو ادارہ آج اللہ کے گھر کو اسلحے سے ''پاک'' کر کے مشرف صاحب کی تحسین کا مستحق بنا ہے، اس پر یہ سوال ابھی تک قرض ہے کہ اللہ کے اس گھر کو اسلحے سے ''ناپاک'' کس نے کیا تھا؟ ۱۸۶۵ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھنے سے لے کر ۱۹۷۹ء کے افغان جہاد تک، کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی دینی مدرسہ بحیثیت ادارہ کسی عسکری سرگرمی میں ملوث ہوا ہو۔ آخر اچانک وہ کیا تبدیلی آئی جس نے سوسالہ تاریخ کو پلک جھپکنے میں بدل دیا؟ ان بوریا نشینوں کے پاس راتوں رات دنیاوی وسائل اور اسلحہ کہاں سے آیا؟ آج مدرسہ کلچر میں جو غیر معمولی تبدیلی آئی ہے، ریاستی ادارے کہاں تک اس کے ذمہ دار ہیں؟ اسی طرح اس سوال کا جواب بھی ابھی تک نہیں مل سکا کہ وہ غیر ملکی دہشت گرد کہاں ہیں، جو اس مدرسے میں پناہ گزین تھے؟ طارق عظیم صاحب اور عبدالرشید غازی صاحب کے مابین گفتگو کی جو ٹیپ حکومت نے جاری کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات پر اتفاق تھا۔ اس کے باوجود قتل عام کو کیوں ناگزیر سمجھا گیا؟

آج خود احتسابی کا مطلب یہ ہے کہ علماے کرام اور دینی مدارس کے ذمہ داران اس پر غور کریں کہ جن لوگوں نے مدرسے کی سوسالہ تاریخ سے انحراف کیا، ان کے ساتھ انھیں کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ مدرسے کے قیام کا بنیادی مقصد دینی روایت کی حفاظت اور ایک مسلمان معاشرے کی مذہبی ضروریات کی تکمیل ہے، جس میں دینی تعلیم کی ضرورت بھی شامل ہے۔ مدرسے نے اس ذمہ داری کو کہاں تک نبھایا؟ لال مسجد میں موجود اسلحے کے بارے میں حکومتی دعووں کی تکذیب کے باوجود، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عبدالرشید غازی صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلح تھے اور انھوں نے ہتھیار پھینکنے سے انکار کیا۔ جس نے ہتھیار اٹھائے ہی نہ ہوں، اس کی طرف سے پھینکنے سے انکار ایک بے معنی بات ہے۔ یہ طرز عمل کسی مدرسے کے ایک ذمہ دار کے کس حد تک شایان شان ہے اور آج اس صورت حال کو کیسے تبدیل کیا جائے کہ دینی مدارس ہمیشہ کی طرح اپنا اصل کردار ادا کرتے رہیں؟

آج خود احتسابی کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ اس سوال پر غور کرے کہ وہ دینی مدارس کو جو وسائل فراہم کر رہا ہے،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کیا وہ انھی مقاصد کے لیے صرف ہوتے ہیں، جن کے لیے وہ ایثار کرتا ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ ان مدارس کے زیادہ تر وسائل اس معاشرے سے جمع ہوتے ہیں۔ معاشرہ یہ خیال کرتا ہے کہ لوگوں کو دینی تعلیم دی جانی چاہیے اور یہاں ایسے ادارے موجود ہوں جو اس کی مذہبی ضروریات کی تکمیل کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے سماج میں کوئی ایک فرد ایسا نہیں ہوگا جو ان مدارس کی اس لیے معاونت کرتا ہو کہ وہ برائی کو ہاتھ سے مٹانے کے لیے نکلیں یا ملک میں اسلام کے سیاسی غلبے کی جدوجہد کریں۔ کیا معاشرہ اس بارے میں سوچنے کے لیے تیار ہے کہ وہ انھی مدارس کی مدد کرے جو اپنا اصل فریضہ سر انجام دے رہے ہیں اور ان مدارس سے تعاون نہ کرے جو اس فریضے سے انحراف کر رہے ہیں؟ سماج کو اس سوال پر بھی غور کرنا ہوگا کہ آج کس طرح کی دینی تعلیم اس کی ضرورت ہے۔

آج حکومت اور ریاستی اداروں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس حادثے کی تمام تر ذمہ داری غازی برادران اور اہل مدرسہ پر ڈال رہے ہیں۔ وہ تمام سوالات جن کا میں نے ذکر کیا اور جو آج قومی میڈیا میں تواتر اور شدت کے ساتھ اٹھائے جا رہے ہیں، حکومتی ایوانوں میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب کا قوم سے خطاب اس کی سب سے بڑی گواہی ہے۔ اس بارے میں حکومتی تکبر کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی مطالبے کو اہمیت دینے پر آمادہ نہیں۔ ۱۲ مئی کو جب کراچی میں قتل عام ہوا اور تمام سول سوسائٹی نے اس کی تحقیقات کے لیے عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا تو مشرف صاحب نے حقارت کے ساتھ بیک جنبش قلم اسے مسترد کر دیا۔ اب ایک بار پھر یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ لال مسجد کے حادثے کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کے لیے بھی ایک عدالتی کمیشن بنایا جائے۔ تادم تحریر حکومت خاموش ہے اور امکان یہی ہے کہ اس مطالبے کا انجام بھی پہلے مطالبے کی طرح ہوگا، یعنی

یہ خون خاک نشیناں تھا جو رزق خاک ہوا

علما اور دینی مدارس کے منتظمین بھی حکومت ہی کو اس سانحے کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں اور اس کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ میرے علم کی حد تک علما اور وفاق المدارس کا کوئی ایک اجلاس ایسا نہیں ہوا جو اس پر غور کرتا کہ اس حادثے نے دینی مدارس کے مستقبل پر کیا اثرات ڈالے ہیں اور ان اداروں کو خالصتاً مذہبی تعلیم کے ادارے بنانے کے لیے کیا اقدام کیے جائیں۔ اسی طرح مستقبل میں اس نوعیت کے واقعات کا کیسے سد باب ہو سکتا ہے۔ علما اور دینی مدارس کے منتظمین نے یہ موقف اختیار کیا کہ لال مسجد والوں کے مطالبات درست ہیں، لیکن طریقۂ کار غلط ہے۔ میں اس نقطۂ نظر کو کبھی سمجھ نہیں سکا۔ کوئی فرد یا گروہ جب اپنی حدود سے تجاوز کر کے کوئی مطالبہ کرتا ہے، تو وہ درست کیسے ہو سکتا ہے؟ دینی مدارس کا کام دینی تعلیم کا فروغ اور اس کی روایت کا علمی دفاع ہے۔ اسلام کا سیاسی غلبہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یا نفاذ اسلام، ان کا مینڈیٹ نہیں ہے۔ اگر دینی مدرسے سے متعلق کوئی آدمی سمجھتا ہے کہ اس وقت یہ کام ضروری ہے تو اسے مدرسہ چھوڑ کر کوئی سیاسی جماعت بنانی چاہیے یا پہلے سے موجود کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مدرسے کا فورم اس کام کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کل قائداعظم یونیورسٹی یا پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کا کوئی گروہ اٹھے اور یہ مطالبہ شروع کر دے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست ہونا چاہیے۔ یا وہ طلبا کا ایک جتھا منظّم کرے اور کسی مدرسے یا دینی دعوت کے ادارے پر پل پڑے جو اس کے خیال میں ملک کے سیکولر تشخص کو مجروح کر رہا ہے۔ اگر کوئی ایسا پروفیسر ہوگا تو ہم اس سے بھی یہی کہیں گے کہ یہ تمھارا منصب نہیں ہے۔ تمھیں اگر اس کام سے دل چسپی ہے تو درس وتدریس کو خیر باد کہو اور کوئی سیاسی جماعت بناؤ یا پھر پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ دنیا میں ہر کام کے آداب اور حدود ہوتے ہیں۔ ان سے تجاوز ہی کسی موقف کے غلط ہونے کے لیے کافی ہے۔ نفاذ اسلام کا مطالبہ قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن کر رہے ہیں۔ وہ اسی کام کے لیے بننے والی جماعتوں میں شامل ہیں اور ان کے اس حق سے کسی کو اصولی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ماضی میں جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ملت کے سیاسی وجود کے لیے کام کرنا چاہا تو جمعیت علماے ہند کے فورم کو استعمال کیا، دارالعلوم دیوبند کو اس کا مرکز نہیں بنایا۔ آج مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نفاذ اسلام کا مطالبہ غلط ہے یا صحیح ہے، مسئلہ یہ ہے کہ جو یہ مطالبہ کر رہا ہے، کیا ملکی قانون، سماجی اخلاقیات اور شریعت نے اسے یہ حق دیا ہے؟

سول سوسائٹی بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابہام کا شکار ہے۔ کوئی حکومت کا حامی ہے اور کوئی لال مسجد والوں کا۔ آج اس کا اصل کام یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے دینی مدارس کس حد تک وہ ذمہ داری ادا کر رہے ہیں، جن کے لیے وہ وجود میں آئے ہیں اور کیا سماجی سطح پر کوئی ایسا طریقۂ کار وضع کیا جا سکتا ہے، جس سے معاشرہ ان کی نگرانی کی ذمہ داری ادا کرے تاکہ وہ اپنے مینڈیٹ سے انحراف نہ کریں۔ اسی طرح آج معاشرے کو جس دینی تعلیم کی ضرورت ہے، اس کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔

جنرل مشرف صاحب نے اگر آج ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کا مشورہ دیا ہے تو ہم سب کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے، لیکن اس پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے خود اپنی مثال پیش کریں اور اس کا آغاز اس ادارے کے احتساب سے کریں جس کے وہ اس وقت آئینی سربراہ ہیں اور جس نے انھیں وردی پہنا رکھی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا، وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ، اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

(ایمان والو، اللہ نے تمھیں ایک عظیم بادشاہی عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اِس موقع پر) اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ نہایت اچھی بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے[۱۲۰]۔ ۵۸

[۱۲۰] امانت کا لفظ ان چیزوں کے لیے آتا ہے جن کا کسی شخص کو امین بنایا جائے۔ یہاں اس سے مراد وہ مناصب اور ذمہ داریاں ہیں جو نظم اجتماعی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تم سے پہلے یہ بادشاہی جن لوگوں کو دی گئی تھی، وہ تو اس میں چور ثابت ہوئے، مگر تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تمھاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اس نعمت عظمیٰ کو پانے کے بعد قوم کی امانتیں اہلیت کی بنیاد پر لوگوں کے سپرد کرو اور عدل و انصاف کو زندگی کے ہر شعبے میں اور اس کی آخری صورت میں قائم کر دینے کی جدوجہد کرتے رہو۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے یہ دوسری بات اپنی تفسیر میں اس طرح واضح فرمائی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ، فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

ایمان والو، (یہ خدا کی بادشاہی ہے، اس میں) اللہ کی اطاعت کرو اور (اُس کے) رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی بھی جو تم میں سے معاملات کے ذمہ دار بنائے جائیں۔ پھر اگر کسی معاملے میں اختلاف رائے ہو تو (فیصلے کے لیے) اُسے اللہ اور (اُس کے) رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے[۱۲۱]۔ ۵۹

"... یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے، اس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے، ان پر اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل وانصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر وغریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو، انصاف خریدنی وفروختنی چیز نہ بننے پائے، اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور واثر اور کسی خوف وطمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔

جن کو بھی اللہ تعالیٰ اس زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اسی عدل کے لیے بخشتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے، اس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع وبصیر کا حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اس سے مخفی رہنے والی نہیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۳۲۳)

[۱۲۱] یہ حکم اس وقت دیا گیا جب قرآن نازل ہو رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مسلمانوں کے درمیان موجود تھے اور وہ اپنے نزاعات کے لیے جب چاہتے، آپ کی طرف اور آپ کی وساطت سے اپنے پروردگار کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ لیکن صاف واضح ہے کہ اللہ ورسول کی یہ حیثیت ابدی ہے، لہٰذا جن معاملات میں کوئی حکم انھوں نے ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے، ان میں مسلمانوں کے اولی الامر کو، خواہ وہ ریاست کے سربراہ ہوں یا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ، وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ
قَبۡلِكَ، یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاكَمُوۡٓا اِلَی الطَّاغُوۡتِ، وَقَدۡ اُمِرُوۡٓا اَنۡ یَّكۡفُرُوۡا بِهٖ،
وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًا بَعِیۡدًا﴿۶۰﴾وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ: تَعَالَوۡا اِلٰی مَآ
اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ، رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا﴿۶۱﴾فَكَیۡفَ،

تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُس پر بھی ایمان لائے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، مگر چاہتے ہیں کہ (اللہ و رسول کو چھوڑ کر) اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے اُسی سرکش کی طرف رجوع کریں جو بدی کا سرغنہ ہے[۱۲۲]، دراں حالیکہ اُنھیں ہدایت کی گئی تھی کہ اُس کا انکار کر دیں۔ (یہ شیطان کے پیرو ہیں) اور شیطان چاہتا ہے کہ اِنھیں دور کی گمراہی میں ڈال دے۔ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور اُس کے رسول کی طرف آؤ تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ وہ تم سے صاف کترا جاتے ہیں۔ مگر اُس وقت کیا ہوگا جب

پارلیمان کے ارکان، اب قیامت تک اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اولی الامر کے احکام اس اطاعت کے بعد اور اس کے تحت ہی مانے جا سکتے ہیں۔ اس اطاعت سے پہلے یا اس سے آزاد ہو کر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان اپنی ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں ان کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔

آیت کے سیاق سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا جو حکم اس میں بیان ہوا ہے، وہ صرف مسلمان حکمرانوں کے لیے ہے۔ ان لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جو کھلے کفر کے مرتکب ہوں، اللہ و رسول کے مقابلے میں سرکشی اختیار کریں یا خدا کے دین کو چھوڑ کر عملاً اپنے لیے کوئی اور دین پسند کر لیں۔ اس طرح کے لوگ قرآن کی یہ آیت سنا کر مسلمانوں سے اپنے لیے اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

[۱۲۲] یہود کے بڑے لیڈر کی طرف اشارہ ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کعب بن اشرف تھا جسے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے موت کی سزا دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ سزا اس پر نافذ کر دی گئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر سرکش ہو چکا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ، ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ
اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ،
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا

اِن کے ہاتھوں کی لائی ہوئی کوئی مصیبت اِن پر آپڑے گی،[۱۲۳] پھر یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے تمھارے پاس آئیں گے کہ ہم نے تو صرف بہتری چاہی تھی اور ہم تو یہی چاہتے تھے کہ کچھ موافقت پیدا ہو جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ اِن کے دلوں میں ہے۔ سو اِن سے اعراض کرو اور اِنھیں نصیحت کرو اور ان کے بارے میں ان کے ساتھ اِس انداز سے بات کرو کہ دلوں میں اتر جائے۔[۱۲۴] (اِنھیں

[۱۲۳] استاذ امام نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے، وہ بعد میں اس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش وہ بدل دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کا احتساب شروع کر دیا۔ منافقین اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے۔ نہ یہود میں اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کر سکیں، نہ مسلمان اب ان کے چکموں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نہ جاے ماندن نہ پاے رفتن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور قسمیں کھا کھا کے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط اب تک رکھتے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں اس میں کسی فساد نیت کو دخل نہیں تھا، بلکہ ان کی خواہش صرف یہ رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف و عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان اور توفیق کے خوب صورت الفاظ سے تعبیر کرتے، لیکن واقعات کے تشت از بام ہو جانے کے بعد اس سخن سازی کا موقع نکل چکا تھا۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۳۲۷)

[۱۲۴] یہ ہدایت اس لیے ہوئی کہ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ نہایت نرم اور کریمانہ ہوتا تھا۔ قرآن نے فرمایا کہ اب زیادہ نرمی برتنے کا موقع نہیں ہے، اس لیے ان منافقوں کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دیا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ، وَلَوۡ اَنَّھُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ جَآءُوۡكَ،
فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَھُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا﴿۶۴﴾ فَلَا
وَرَبِّكَ، لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡكَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَھُمۡ، ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۤ

بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اِسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اُس کی اطاعت کی جائے۔[۱۲۵] (اِنھیں بتاؤ کہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اِنھوں نے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے)۔ اگر یہ اُس وقت تمھاری خدمت میں حاضر ہو جاتے، جب اِنھوں نے اپنی جان پر یہ ظلم ڈھایا تھا اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان پاتے۔[۱۲۶] لیکن نہیں اے پیغمبر، تمھارے پروردگار کی قسم،[۱۲۷] یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے،

جائے اور واضح الفاظ میں تنبیہ کر دی جائے تاکہ یہ سنبھلنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ کی آخری گرفت سے پہلے پہلے سنبھل جائیں۔

[۱۲۵] یہ رسول کا صحیح مرتبہ واضح فرمایا ہے کہ رسول صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگ اسے نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ پھر یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔ انسان کو خدا کی محبت اسی اطاعت اور اسی اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔

[۱۲۶] آیت میں رسول کے استغفار کی جو شرط عائد کی گئی ہے، استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...ایک تو یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلۂ شفاعت ہے جس سے ان کے اس گناہ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے، دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ان کا 'تحاکم الی الطاغوت' رسول کی صریح توہین ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۲۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ، وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا﴿٦٥﴾وَلَوۡ اَنَّا كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَنِ
اقۡتُلُوۡا اَنۡفُسَكُمۡ، اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِيَارِكُمۡ، مَّا فَعَلُوۡهُ اِلَّا قَلِيۡلٌ مِّنۡهُمۡ، وَلَوۡ اَنَّهُمۡ
فَعَلُوۡا مَا يُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَاَشَدَّ تَثۡبِيۡتًا﴿٦٦﴾وَاِذًا لَّاٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ
لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِيۡمًا﴿٦٧﴾وَلَهَدَيۡنٰهُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا﴿٦٨﴾وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ

جب تک اپنے اختلافات میں تمھی کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اُس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔[۱۲۸] (یہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) اور (حقیقت یہ ہے کہ) اگر ہم اِن پر فرض کر دیتے کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل آؤ، (جس طرح ہم نے موسیٰ کے زمانے میں کیا تھا)، تو ان میں سے کم ہی اس حکم کی تعمیل کرتے۔ اِس وقت جو نصیحت اِنھیں کی جا رہی ہے، یہ اگر اُس پر عمل کرتے تو اِن کے حق میں بہتر ہوتا اور (اِس کے نتیجے میں) یہ (دین پر) زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہتے۔ یہ ایسا کرتے تو اِنھیں ہم اپنی طرف سے بہت بڑا اجر عطا کرتے اور اِنھیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش دیتے۔ (اِنھیں بتاؤ کہ) جو اللہ اور

---

[۱۲۷] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس التفات خاص میں جو دل نوازی ہے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بلاغت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان کے ذوق سے کچھ بہرہ عطا فرمایا ہے۔

[۱۲۸] منافقین کی جھوٹی قسم اوپر آیت ۶۲ میں مذکور ہے۔ یہ قرآن نے سچی قسم سے اس کی تردید کرتے ہوئے رسول کے مقام و مرتبہ کی آخری حد واضح کر دی ہے کہ دین و شریعت کے احکام تو ایک طرف، اپنے درمیان پیدا ہونے والی نزاعات تک میں رسول کے فیصلے کو بے چون و چرا اور پورے اطمینان کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمھارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمھارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے، اس وجہ سے اس کا حق صرف

وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ، وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ،
وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾

(اُس کے) رسول کی اطاعت کریں گے، وہی ہیں جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین۔[129] کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی عنایت ہے اور (اِس کے لیے) اللہ کا علم کافی ہے۔[130] ۶۰-۷۰

ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۲۹)

[۱۲۹] ان میں 'صدیقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے علم و عمل میں سچے ہوں اور ہر موقع پر یہ سچائی اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیں اور 'شہداء' ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو جان کی بازی لگا کر بھی حق کی گواہی دینے والے ہوں۔

[۱۳۰] یعنی اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ کا علم کافی ہے کہ کون اس کی عنایتوں کا مستحق ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جانتا ہے، ان سے بے خبر نہیں ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایمانیات

(۱۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علامات

یہ دن کب آئے گا؟ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کا وقت اسی کے علم میں ہے اور اپنے کسی نبی یا فرشتے کو بھی وہ اس پر مطلع نہیں کرتا۔[۹۲] اس کے آثار و علامات، البتہ قرآن و حدیث اور قدیم صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض عمومی نوعیت کے ہیں اور بعض کی نوعیت متعین واقعات و حوادث کی ہے۔ پہلی قسم کی علامات میں سے کوئی چیز قرآن میں بیان نہیں ہوئی۔ ان کا ذکر روایتوں ہی میں ہوا ہے۔ دوسری قسم کی علامتوں میں سے بھی ایک ہی چیز قرآن میں بیان ہوئی ہے اور وہ یاجوج و ماجوج کا خروج ہے۔ لہٰذا یقینی علامت تو یہی ہے۔ اس کے علاوہ جو علامات بالعموم بتائی جاتی ہیں، ان میں سے بعض ان روایتوں میں بیان ہوئی ہیں جو محدثین کی اصطلاح کے مطابق صحیح کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ظاہر ہو چکی ہیں اور باقی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تو لازماً ظاہر ہو جائیں گی۔

پہلی قسم کی علامات اس اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتی ہیں جو قیامت سے پہلے پورے عالم میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ علم اٹھا لیا جائے گا، جہالت بڑھ جائے گی، زنا، شراب نوشی اور قتل و غارت گری عام ہوگی، یہاں تک کہ

۹۲؎ الاعراف ۷: ۱۸۷۔ طٰہٰ ۲۰: ۱۵۔ حٰم السجدہ ۴۱: ۴۷۔

لوگوں کو بغیر کسی جرم کے مارا جائے گا؛ مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں اتنی کم ہو جائے گی کہ پچاس عورتوں کے معاملات ایک مرد کے سپرد ہوں گے؛ دنیا میں صرف اشرار باقی رہ جائیں گے، خدا کا نام لینے والوں سے دنیا خالی ہو جائے گی۔[93]

دوسری قسم کی علامات میں سے اہم ترین یاجوج و ماجوج کا خروج ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ، وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ، وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. يٰوَيْلَنَا، قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا، بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۹۶-۹۷)

''یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے، جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں، اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آ پہنچے تو ناگہاں دیکھیں کہ اِن منکروں کی نگاہیں ٹنگی رہ گئی ہیں۔ اُس وقت کہیں گے: ہم اِس سے غفلت میں پڑے رہے، بلکہ ہم نے تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا تھا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ دونوں نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ پھر انھی کے بعض قبائل یورپ پہنچے اور اس کے بعد امریکہ اور آسٹریلیا کو آباد کیا۔ صحیفۂ حزقی ایل میں ان کا تعارف روس، ماسکو اور توبالسک کے فرماں روا کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

''اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد، جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر۔'' (حزقی ایل ۳۸: ۱-۲)

''پس اے آدم زاد تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ: خداوند یوں فرماتا ہے: دیکھ اے جوج، روش، مسک اور توبل کے فرماں روا، میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔'' (حزقی ایل ۳۹: ۱-۲)

یوحنا عارف کے مکاشفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خروج کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ایک ہزار سال بعد کسی وقت ہو گی۔ اس زمانے میں یہ زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گے۔ ان کا فساد جب انتہا کو پہنچے گا تو ایک آگ آسمان سے اترے گی اور قیامت کا زلزلہ برپا ہو جائے گا:

''اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی، یعنی جوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے

۹۳؎ بخاری، رقم ۸۰، ۸۱۔ مسلم، رقم ۲۶۷۱، ۲۹۰۸، ۱۴۸۔

برابر ہوگا، اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر[94] کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان سے آگ نازل ہو کر انھیں کھا جائے گی۔'' (مکاشفہ ۲۰: ۷-۹)

یہی زمانہ قرب قیامت کی ان علامتوں سے بھی متعین ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمائی ہیں، جب وہ لوگوں کی تعلیم کے لیے انسانی صورت میں آپ کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا:

ان تلد الامة ربتها، وان ترى الحفاة العراة العالة، رعاء الشاء، يتطاولون فى البنيان. (مسلم، رقم ۸)

''ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے گی اور دوسری یہ ہے کہ تم (عرب کے) اِن ننگے پاؤں، ننگے بدن پھرنے والے کنگال چرواہوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے دیکھو گے۔''

ان میں سے دوسری علامت تو بالکل واضح ہے۔ پچھلی صدی سے اس کا ظہور سرزمین عرب میں ہر شخص بچشم سر دیکھ سکتا ہے۔ پہلی علامت کا مصداق متعین کرنے میں لوگوں کو دقت ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا مفہوم بھی بالکل واضح ہے۔ اس سے مراد ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کا خاتمہ ہے۔ یہ دونوں واقعات ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ پیشین گوئی قرب قیامت کا زمانہ بالکل متعین کر دیتی ہے۔

اس کے بعد جو علامتیں ظاہر ہوں گی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یاجوج و ماجوج کے خروج کو شامل کر کے ایک ہی جگہ بیان کر دی ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

ان الساعة لاتكون حتى تكون عشر آيات: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف فى جزيرة العرب، والدخان، والدجال، ودابة الارض، و ياجوج و ماجوج، وطلوع الشمس من مغربها، ونار تخرج من قعرة عدن ترحل الناس، وريح تلقى الناس فى البحر. (مسلم، رقم ۲۹۰۱)

مدعا یہ ہے کہ قیامت کی دس علامتیں ہیں۔ یہ جب تک ظاہر نہ ہو جائیں، قیامت برپا نہ ہوگی:

۱۔ مشرق میں زمین کا دھنس جانا۔

---

۹۴ مقدسوں کی لشکر گاہ سے مراد مدینہ اور عزیز شہر سے مراد شہر امین مکہ ہے۔ یہ تعبیرات اتنی واضح ہیں کہ الہامی صحائف کے اسالیب اور ان شہروں کی تاریخ سے واقف کسی شخص کو انھیں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۲۔مغرب میں زمین کا دھنس جانا۔

۳۔جزیرہ نماے عرب میں زمین کا دھنس جانا۔

۴۔دھواں،اس سے مراد کوئی بڑا ایٹمی انفجار بھی ہو سکتا ہے۔

۵۔دجال، یہ بڑے دغاباز،فریبی اور مکار کے معنی میں اسم صفت ہے۔اس کا ذکر 'المسیح الدجال' کے نام سے بھی ہوا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت سے پہلے کوئی شخص مسیح ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرے گا اور مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے اندر سیدنا مسیح علیہ السلام کی آمد کے تصور سے فائدہ اٹھا کر اپنے بعض کمالات سے لوگوں کو فریب دے گا۔بعض روایتوں میں ہے کہ یہ ایک آنکھ سے اندھا ہوگا اور ایمان والوں کے لیے اس کا دجل اس قدر واضح ہوگا کہ اس کی پیشانی پر گویا کفر لکھا ہوا دیکھیں گے۔[95]

۶۔زمین کا جانور، جو غالباً اسی طرح زمین کے پیٹ سے براہ راست پیدا ہو جائے گا، جس طرح تمام مخلوقات ابتدا میں پیدا ہوئی ہیں۔

۷۔یاجوج وماجوج کا خروج، یہ شروع ہو چکا اور اب بتدریج اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔

۸۔سورج کا مغرب سے طلوع۔

۹۔آگ جو عدن کے گڑھے سے نکل کر لوگوں کو ہانکے گی۔

۱۰۔ہوا جو انھیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔

ان کے علاوہ ظہور مہدی اور مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کو بھی قیامت کی علامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ظہور مہدی کی روایتیں محدثانہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ان میں سے کچھ ضعیف اور کچھ موضوع ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایتوں میں جو سند کے لحاظ سے قابل قبول ہیں، ایک فیاض خلیفہ کے آنے کی خبر دی گئی ہے،[96] لیکن دقت نظر سے غور کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا مصداق سیدنا عمر بن عبد العزیز تھے جو خیر القرون کے آخر میں خلیفہ بنے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی ان کے حق میں حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے۔اس کے لیے کسی مہدی موعود کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔نزول مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محل نظر ہیں۔

۹۵؎ بخاری، رقم ۱۸۸۲، ۳۴۳۹، ۷۱۳۱۔ مسلم، رقم ۱۶۹، ۲۹۳۳، ۲۹۳۸۔

۹۶؎ مسلم، رقم ۲۹۱۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اولاً، اس لیے کہ مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآن مجید میں کئی پہلوؤں سے زیر بحث آئی ہے۔ ان کی دعوت اور شخصیت پر قرآن نے جگہ جگہ تبصرہ کیا ہے۔ روز قیامت کی ہلچل بھی قرآن کا خاص موضوع ہے۔ ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم و عقل اس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔

ثانیاً، اس لیے کہ سورۂ مائدہ میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے جو قیامت کے دن ہوگا۔ اس میں اللہ تعالیٰ ان سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں پوچھیں گے کہ کیا تم نے یہ تعلیم انھیں دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ اس کے جواب میں وہ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ میں نے تو ان سے وہی بات کہی جس کا آپ نے حکم دیا تھا اور جب تک میں ان کے اندر موجود رہا، اس وقت تک دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو میں نہیں جانتا کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ہے۔ اس کے بعد تو آپ ہی ان کے نگران رہے ہیں۔ اس میں دیکھ لیجیے، مسیح علیہ السلام اگر ایک مرتبہ پھر دنیا میں آ چکے ہیں تو یہ آخری جملہ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اس کے بعد تو انھیں کہنا چاہیے کہ میں جانتا ہوں اور ابھی کچھ دیر پہلے ان لوگوں کی گمراہی پر انھیں متنبہ کر کے آیا ہوں۔ فرمایا ہے:

مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَآ اَمَرۡتَنِيۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ، رَبِّيۡ وَرَبَّكُمۡ، وَكُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ فِيۡهِمۡ، فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ، كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ، وَاَنۡتَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ شَهِيۡدٌ. (المائدہ ۵: ۱۱۷)

”میں نے تو اِن سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ رہا، جب تک میں ان کے اندر موجود رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو ان پر تو ہی نگران رہا ہے اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔“

ثالثاً، اس لیے کہ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحۂ عمل بیان فرمایا ہے۔ یہ موقع تھا کہ قیامت تک کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بیان کر رہے تھے جو ان کے اور ان کے پیرووں کے ساتھ ہونے والی ہیں تو یہ بھی بیان کر دیتے کہ قیامت سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تجھے دنیا میں بھیجنے والا ہوں۔ مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ سیدنا مسیح کو آنا ہے تو یہ خاموشی کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آیت یہ ہے:

www.javedahmadghamidi.net

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ، وَرَافِعُكَ اِلَیَّ، وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا، وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ، ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ، فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ. (۳:۵۵)

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا اور (تیرے) اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک ان منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے۔ سو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔''

احوال

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قیامت کس طرح برپا ہوگی؟ اس کی تفصیلات قرآن میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ زمین و آسمان پر کیا گزرے گی، مہ و آفتاب اور نجوم و کواکب کے ساتھ کیا ہوگا، زمین پر بسنے والی مخلوقات کس صورت حال سے دوچار ہوں گی، لوگ کس طرح قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کے حضور میں جمع ہوں گے، قرآن میں جگہ جگہ اس کی تصویریں ہیں۔ ادب جاہلی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا ذوق تشبیہ سے زیادہ تصویر کا رہا ہے۔ قرآن نے اس کی رعایت کی ہے اور انذار قیامت کے لیے اس کی ہلچل کا ایسا مرقع کھینچ دیا ہے کہ اس کا قاری گویا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے دیکھتا ہے۔ اس سے حوادث کی جو ترتیب سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے:

۱۔ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار چلا رہے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی راستے میں ہوگا، کوئی بازار میں، کوئی مجلس میں اور کوئی اپنے گھر میں، کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ نظم عالم درہم برہم ہونے والا ہے کہ اچانک صور پھونکا جائے گا اور زلزلۂ قیامت برپا ہو جائے گا:

وَیَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ، فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ، اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ. (النمل ۲۷:۸۷)

''اور اس دن کا خیال کرو، جب صور پھونکا جائے گا اور وہ سب جو زمین و آسمان میں ہیں، ہول کھا جائیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے گا۔''

یہ صور کیا ہے؟ ہماری زبان میں اسے نرسنگھا، بوق یا قرنا کہا جاتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت کو جاننا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق امور متشابہات سے ہے۔ تاہم جو لفظ اس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس کا کچھ تصور اس سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال

کرتے ہیں جو خود انسانوں کے ہاں اسی سے ملتے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہوتا ہے، نہ یہ کہ ہم اس چیز کو بعینہٖ اس طرح سمجھ لیں، جس طرح وہ دنیا میں پائی جاتی ہے۔ قدیم ایام میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ وغیرہ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت برپا کرنے کے لیے بھی پھونکی جائے گی، جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے جیسی ہوگی۔ اس سے تمام مخلوقات پر شدید گھبراہٹ اور ہول کی کیفیت طاری ہوگی، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے۔[97] یہاں تک کہ اس کی ہول ناک آواز سے تمام مخلوقات بے ہوش ہو جائیں گی:

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ، اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ. (الزمر ۳۹: ۶۸)

''اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے گا۔''

زمین کی آبادی پر اس کے نتیجے میں جو کچھ گزرے گی، اس کا نقشہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک کے بعد زلزلے کا دوسرا جھٹکا آئے گا اور زمین کی حالت اس کشتی کی سی ہو جائے گی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو تو دل کانپ رہے ہوں گے، نگاہیں خوف زدہ ہوں گی اور لوگ ایسے مدہوش اور متوالے ہو جائیں گے کہ گویا عذاب الٰہی کی ہولناکی نے سب کو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ، اتَّقُوْا رَبَّکُمْ، اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ، یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ، وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا، وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی، وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی، وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ. (الحج ۲۲: ۱-۲)

''لوگو، اپنے پروردگار سے ڈرو۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی ہول ناک چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے، اُس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور لوگ تمھیں مدہوش نظر آئیں، درآں حالیکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔''

۲۔ یہی وہ وقت ہے جب نظم عالم درہم برہم ہونا شروع ہوگا۔ پوری کائنات میں ایک ایسا زلزلۂ عظیم برپا ہو جائے گا جس سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، سمندر پھوٹ بہیں گے، تمام کہکشانیں اور اجرام فلکی اپنی جگہ چھوڑ کر

۹۷؎ التکویر ۸۱: ۴-۵۔

ایک دوسرے میں جا پڑیں گے۔ ہر طرف ایسا اختلال ہو گا کہ خیال اس کے تصور سے اور الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہوں گے۔ یہ سلسلہ ایک ایسی مدت تک جسے خدا ہی جانتا ہے، جاری رہے گا:

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ، وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ، وَاِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ، وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ، وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ، وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ...عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّآ اَحۡضَرَتۡ. (التکویر ۸۱: ۱-۶، ۱۴)

''اُس وقت، جب سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی، اور جب تارے ماند پڑ جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب دس ماہہ گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (اپنی سب دشمنی بھول کر ایک ہی جگہ) اکٹھے ہو جائیں گے، اور جب سمندر ابل پڑیں گے...اُس وقت، (لوگو، تم میں سے) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔''

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ، وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ، وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ، وَاَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا وَتَخَلَّتۡ، وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ. (الانشقاق ۸۴: ۱-۵)

''وہ دن، جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا، اور اُسے یہی زیبا ہے۔ اور وہ دن جب زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اُس کے اندر ہے، اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اُسے یہی چاہیے۔ (وہ دن تمھارے پروردگار سے ملاقات کا دن ہوگا)۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳۔ اس کے بعد وہ مرحلہ شروع ہو گا جسے قرآن میں اعادۂ خلق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی اختلال سے بتدریج ایک نیا نظام طبیعت وجود میں آئے گا:

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ، کَمَا بَدَاۡنَآ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُهٗ، وَعۡدًا عَلَیۡنَا، اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ. (الانبیاء ۲۱: ۱۰۴)

''اُس دن کا خیال کرو، جب ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے، جس طرح طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی، اسی طرح اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے، اور ہم یہ کر کے رہیں گے۔''

اس کی صورت کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تمام اجرام فلکی، زمین، سورج، چاند، تارے اور اربوں ستاروں

اور سیاروں سے بنی ہوئی کہکشانیں نئے قوانین اور نئے نوامیس کے ساتھ ایک نئی زمین اور نئے آسمان میں تبدیل ہو جائیں گی: 'یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ'[98] (اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ زمین دوسری زمین میں بدل دی جائے گی اور آسمان بھی)۔ قرآن کا بیان ہے کہ اس موقع پر ایک مرتبہ پھر نفخ صور ہو گا جس سے تمام لوگ جی اٹھیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر پروردگار عالم کی عدالت میں پیشی کے لیے حاضر ہو جائیں گے:

ثُمَّ نُفِخَ فِیۡهِ اُخۡرٰی فَاِذَا هُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ. (الزمر ۳۹:۶۸)

''پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔''

وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ. (یٰس ۳۶:۵۱)

''اور صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف چل پڑیں گے۔''

[باقی]

۹۸؎ ابراہیم ۱۴:۴۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حافظ محمد زبیر

علامہ جاوید احمد غامدی کا تصور ''فطرت''

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کے ماخذ دین ایک نظر میں

ماخذ دین سے مراد وہ شرعی دلائل ہیں جن سے شرعی احکام کو مستنبط کیا جاتا ہے۔اہل سنت کے ہاں یہ چار ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ یہ وہ ماخذ دین ہیں جو فقہاے اہل سنت کے ہاں متفق علیہ ہیں۔اس کے علاوہ کچھ ماخذ ایسے بھی ہیں جو فقہا کے درمیان اختلافی ہیں، مثلاً قول صحابی، استحسان، مصلحت مرسلہ، استصحاب، سد الذرائع، عرف وعادت، شرائع من قبلنا وغیرہ۔اہل سنت کے ماخذ دین کے بالمقابل غامدی صاحب کے ماخذ علی الترتیب درج ذیل ہیں:

اہل سنت کے ماخذ دین	غامدی صاحب کے ماخذ دین
۱۔قرآن ۲۔سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۳۔اجماع ۴۔قیاس	۱۔دین فطرت کے بنیادی حقائق ۲۔سنت ابراہیمی ۳۔نبیوں کے صحائف ۴۔قرآن

غامدی صاحب کے اصل اصول تو یہی چار ہیں، جبکہ ان چار کے علاوہ بھی غامدی صاحب کے کچھ اصول ہیں جن سے ضرورت پڑنے پر استدلال کرتے ہیں، لیکن ان کو مستقل ماخذ دین نہیں سمجھتے۔ یہ اصول درج ذیل ہیں:

۵۔حدیث

۶۔اجماع

۷۔امین احسن اصلاحی، جنھیں وہ امام کہتے ہیں۔

اس باب میں ہم غامدی صاحب کے اصول 'دین فطرت کے بنیادی حقائق' پر کچھ معروضات پیش کریں گے۔

غامدی صاحب کے نزدیک سب سے پہلا ماخذ جس سے دین حاصل ہوتا ہے، وہ فطرت انسانی ہے اور یہی ماخذ ان کے نزدیک اصل الاصول یعنی باقی تمام ماخذ کی بنیاد بھی ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر اس کو ثابت کریں گے۔ دین کا دوسرا ماخذ ان کے نزدیک نبیوں کی سنت ہے، یعنی ایسے اعمال جن پر تمام انبیا عمل کرتے چلے آئے ہیں، چونکہ یہ اعمال حضرت ابراہیم کی زندگی میں آکر ایک واضح شکل اختیار کر گئے تھے، اس لیے اب ان اعمال کی نسبت پچھلے انبیا کی بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہوگی۔ تیسرا ماخذ ان کے نزدیک نبیوں کے صحائف یعنی تورات، انجیل اور زبور وغیرہ ہیں۔ اور دین کا چوتھا اور آخری ماخذ ان کے نزدیک قرآن مجید ہے۔ اسی لیے وہ قرآن کو دین کی آخری کتاب کہتے ہیں، یعنی دین تو پہلے سے چلا آرہا ہے اور قرآن نے آکر اس کی تکمیل کی ہے۔ باقی جہاں تک حدیث رسول یا اجماع امت کا معاملہ ہے، اس کو غامدی صاحب دین کا کوئی مستقل ماخذ نہیں مانتے۔ لہٰذا غامدی صاحب کے اصل اصول چار ہی ہیں جن پر ان کی پوری فکر استوار ہے۔ غامدی صاحب نے اپنے ان چار اصولوں کو اپنی کتاب ''میزان'' (فصل اصول و مبادی) میں صفحہ ۴۷ سے ۵۲ تک تفصیلاً بیان کیا ہے۔ ''المورد'' کے ریسرچ سکالر اور غامدی صاحب کے شاگرد خاص جناب منظور الحسن صاحب غامدی صاحب کے ماخذ دین سے متعلقہ ''میزان'' کی اس طویل عبارت کا خلاصہ اپنے استاد محترم کی رہنمائی میں ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

> ''قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۱)

ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فطرت انسانی اس قابل ہے کہ

www.javedahmadghamidi.com

اس سے دین اسلام، احکام الٰہی، اوامر ونواہی یا حلال وحرام کا تعین ہوسکتا ہے۔ اسلام کے دین فطرت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے بندوں کو جس فعل کے بھی کرنے کا حکم دیا ہے فطرت سلیمہ اس فعل کے کرنے کی طرف ایک فطری رجحان اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور جس فعل کے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں روک دیا ہے فطرت سلیمہ بھی اس فعل سے ابا محسوس کرتی ہے۔ احکام الٰہی فطرت انسانی کے مطابق تو ہیں، لیکن فطرت انسانی سے ان کا تعین نہیں ہوسکتا۔ یہی غلط فہمی جس میں آج غامدی صاحب مبتلا ہیں، ایک دور میں معتزلہ کو لگی۔ معتزلہ کا کہنا یہ تھا کہ عقل سے شریعت کا تعین ہوسکتا ہے۔ عقل جس چیز کو اچھا سمجھے گی، شریعت کی نظر میں بھی وہ چیز مستحسن ہے اور عقل جس کو برا سمجھے گی، شریعت کی نظر میں بھی وہ چیز بری ہے۔ معتزلہ نے جو مقام عقل انسانی کو دیا تھا، غامدی صاحب اسی درجے پر فطرت انسانی کو رکھتے ہیں۔ غامدی صاحب کے بقول اللہ کے احکامات، شریعت اسلامیہ، حلال وحرام اور اوامر ونواہی کا تعین کرنے کے لیے، فطرت انسانی سب سے بڑا اور بنیادی ماخذ ہے۔ قرون اولیٰ میں امام ابوالحسن الاشعری اور امام ابومنصور ماتریدی نے معتزلہ کے اس موقف کا کہ عقل سے بھی اللہ کے حکم کو معلوم کیا جا سکتا ہے، سختی سے رد کیا اور اہل سنت کے موقف کو واضح کیا، جس کی تفصیلات اصول کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کا اصل مقصد بھی غامدی صاحب کے افکار کی روشنی میں سامنے آنے والے اعتزال جدید کی کج فہمیوں کو اہل سنت کے اصولوں کی روشنی میں واضح کرنا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اپنی اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کا تصور فطرت

غامدی صاحب اپنی کتاب ''میزان'' کی فصل ''اصول ومبادی'' میں لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو جانور پیدا کیے ہیں، ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں۔ یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے، اس لیے ان سے ابا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دسترخوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول وبراز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا

مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت وحرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں اگر تزکیے کے بغیر مر جائیں تو ان کا کیا حکم ہونا چاہیے؟ انھی جانوروں کا خون کیا ان کے بول وبراز کی طرح نجس ہے یا اسے حلال و طیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ ان سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ 'قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ' اور بعض جگہ 'اِنَّمَا' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں... بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، درآں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔'' (۳۷-۳۹)

اسی طرح غامدی صاحب ایک اور جگہ اپنی کتاب ''میزان'' (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ دین فطرت کے حقائق،

۲۔ سنت ابراہیمی،

۳۔ نبیوں کے صحائف۔

پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جس سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...(التوبہ ۹:۷۱)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ باہم دگر معروف کی نصیحت کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔''

اس معاملے میں اگر کسی جگہ اختلاف ہو تو زمانۂ رسالت کے اہل عرب کا رجحان فیصلہ کن ہوگا۔'' (۴۸-۴۹)

''المورد'' کے ریسرچ سکالر جناب منظور الحسن صاحب غامدی صاحب کے ماخذ دین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیا کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی سورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۴، ۱۱)

اپنے اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے فنون لطیفہ (موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ) کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح انھوں نے اپنے اسی اصول کو استعمال کرتے ہوئے تمام سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا۔ تفصیلات کے لیے ''المورد'' کی سائٹ (urdu.understanding-islam.org) میں سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں۔

غامدی صاحب کے اصول فطرت کی غلطی

غامدی صاحب کا مذکورہ بالا اصول فطرت غلط ہے اور اس کی غلطی کی درج ذیل وجوہات ہیں:

کیا شریعت نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ شریعت نے کھانے کے جانوروں میں صرف چار چیزوں سؤر، خون، مردار اور

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

خدا کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کو حرام قرار دیا ہے۔ غامدی صاحب ''میزان'' (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ 'قُل لَّآ اَجِدُ فِیمَا اُوحِیَ' اور بعض جگہ 'اِنَّمَا' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۷-۳۸)

غامدی صاحب نے اپنے ایک غلط اصول (کہ حدیث کے ذریعے سے قرآن پر اضافہ یا اس کا نسخ نہیں ہوسکتا) کو سیدھا کرنے کے لیے یہ سارا فلسفہ گھڑا۔ غامدی صاحب کے نزدیک گدھا حرام ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے، بلکہ ان کی فطرت انھیں یہ بتلاتی ہے کہ گدھا سواری کرنے کا جانور ہے نہ کہ کھانے کا، اس لیے یہ فطری محرمات میں سے ہے۔ غامدی صاحب ''میزان'' (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''وہ (یعنی انسان) جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۷)

غامدی صاحب کی فطرت کا اونٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی تو سواری کا جانور ہے! امر واقعہ تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں سواری کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا جانور اونٹ تھا، اس کے بعد گھوڑا، جبکہ گدھے کا استعمال سواری کے لیے تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غامدی صاحب کی فطرت گدھے کو حرام اور اونٹ کو حلال قرار دیتی ہے؟ اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ اونٹ کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے تو پھر غامدی صاحب کے اس بیان کا کیا مطلب ہے کہ:

''جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔''

(میزان، جاوید احمد غامدی ۳۸)

فطری محرمات کا اصول وضع کر کے غامدی صاحب نے دین میں ایک نئے فتنے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور یہ فتنہ کس طرح آگے بڑھ رہا ہے، اس کا اندازہ ''المورد'' کے ایک ریسرچ سکالر امیر عبدالباسط صاحب کے شراب سے متعلقہ ایک سوال کے جواب سے ہوتا ہے:

''اپنے پچھلے جواب میں ہم نے (شراب کے لیے) ناپسندیدہ کا لفظ حرمت کے مقابلے میں اصطلاح کے طور پر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

استعمال نہیں کیا۔اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ شراب پینا شرعی حرمتوں میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ بنیادی یعنی فطری حرمتوں میں سے ہے...آپ (سائل) نے فرمایا کہ ہماری رائے نصوص شریعہ کے خلاف ہے۔اگر آپ قرآن کی کوئی ایسی آیت پیش کر دیں جس میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو واضح لفظوں میں حرام قرار دیا ہے تو ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنے میں ہرگز کوئی تامل نہیں ہوگا۔''

(urdu.understanding-islam.org)

یہ فتاویٰ جات غامدی صاحب کی نگرانی میں قائم شدہ ''المورد'' کی سرکاری ویب سائٹ (urdu.understanding-islam.org) پر جاری کیے جا رہے ہیں۔کیا شراب کی حرمت کے بارے میں قرآن کے چار مختلف انداز سے تاکیدی اور صریح بیانات 'رِجۡسٌ' اور 'مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطَانِ' اور 'فَاجۡتَنِبُوۡهُ' اور 'فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ' سے بھی اس کی شرعی حرمت ثابت نہیں ہوتی؟ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کیا فطرت انسانی سے حلال وحرام کا تعین ہو سکتا ہے؟

غامدی صاحب کے نزدیک کھانے کے جانوروں میں حلال وحرام کے تعین میں فطرت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت وحرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا ممکن نہ تھا۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۷)

غامدی صاحب کے نزدیک شریعت نے کھانے کے جانوروں میں صرف چار چیزوں کو حرام کیا ہے۔اس کے علاوہ حرام جانوروں کے بارے میں ہم اپنی فطری رہنمائی کی روشنی میں ایک جامع فہرست تیار کر سکتے ہیں۔ایک جگہ ''میزان'' (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

(میزان، جاوید احمد غامدی ۳۸)

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غامدی صاحب کی یہ مذکورہ بالا عبارات کس قدر گمراہ کن افکار پر مشتمل ہیں۔ کسی چیز کو حلال وحرام ٹھہرانے کا اختیار اصلاً اللہ کے پاس اور تبعاً اس کے رسول کے پاس ہوتا ہے۔ غامدی صاحب کا عام انسانوں کو تحلیل وتحریم کا اختیار تفویض کرنا خدائی دعویٰ کرنے کے مترادف ہے۔ غامدی صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ عام انسانوں کے بارے یہ کہیں کہ وہ اپنی فطرت سے جس کو چاہیں حلال بنالیں اور جس کو چاہیں حرام ٹھہرالیں؟ قرآن نے دوٹوک الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ تحلیل وتحریم کا اختیار کسی انسان کے پاس نہیں ہے۔ مشرکین مکہ نے جب اپنی طرف سے بعض کھانے کی چیزوں کو حرام ٹھہرالیا تو قرآن نے ان کے اس اقدام پر تنقید کی۔ سورۃ الانعام میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ. (۶:۱۴۰)

''اور انھوں نے اللہ کے عطا کردہ رزق کو حرام ٹھہرا لیا، اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے۔ تحقیق وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والوں میں سے نہ تھے۔''

اگر شریعت نے بقول غامدی صاحب کھانے کے جانوروں میں صرف چار کو ہی حرام قرار دیا تھا اور باقی جانوروں کی حلت وحرمت کا فیصلہ انسانی فطرت پر چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے اس فعل پر تنقید کیوں کی کہ انھوں نے اپنی مرضی سے بعض جانوروں کو حرام ٹھہرالیا؟ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنْثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنْثَيَيْنِ. (الانعام۶:۱۴۳)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ سلم) ان سے کہہ دیں کیا اللہ تعالیٰ نے دونوں مذکر (نر) کو حرام کیا ہے یا دونوں مونث (مادہ) کو یا اس کو جو دونوں مونث (مادہ) کے رحم میں ہو؟''

یہ آیت بھی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ تحلیل وتحریم کا اختیار اللہ کے پاس ہے نہ کہ انسانی فطرت کے پاس۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا. (الانعام۶:۱۵۰)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے کہہ دیں کہ تم اپنے گواہوں کو لے آؤ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

اگر صرف فطرت سے محرمات کا تعین جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ مشرکین سے یہ مطالبہ نہ کرتا کہ ان جانوروں کی حرمت پر اللہ کی نازل کردہ شریعت سے کوئی دلیل پیش کرو۔ ایک اور جگہ مشرکین مکہ سے خطاب ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ. (النحل ۱۶: ۱۱۶)

''اور تم مت کہو جو کہ تمھاری زبانیں جھوٹ بکتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تا کہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ سکو۔''

یہ آیت بھی اس مسئلے میں نص ہے کہ انسانی فطرت سے حلال وحرام کا تعین کرنا اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔

کس کی فطرت کا اعتبار ہوگا؟

غامدی صاحب کے نزدیک کھانے کے جانوروں میں انسانی فطرت سے حلال وحرام کا تعین ہوگا۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف فطرت کی صورت میں کس کی فطرت معتبر ہوگی؟ مثلاً غامدی صاحب نے موسیقی کو مباحات فطرت میں شامل کیا ہے جبکہ علما اس کو محرمات میں شمار کرتے ہیں۔اب کس کی فطرت کو لیں گے اور کس کی فطرت کو چھوڑیں گے؟ غامدی صاحب اس مسئلے کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی کھانے کے جانور کے بارے میں انسانی فطرت کی آرا مختلف ہو جائیں تو جمہور کی رائے پر عمل کیا جائے گا۔غامدی صاحب ''میزان'' (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

> ''اس میں شبہ نہیں کہ اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے،لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۷)

غامدی صاحب کے اس سنہری اصول کی روشنی میں دنیا کے انسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے سؤر تک کو اپنی فطرت سے حلال کر رکھا ہے۔اور کچھ بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں ''المورد'' کا کوئی ریسرچ اسکالر یہ تحقیق پیش کر دے کہ قرآن نے جس سؤر کو حرام قرار دیا ہے وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا سؤر ہے، رہا آج کا سؤر جس کی مغرب میں باقاعدہ فارمنگ کی جاتی ہے، وہ فطرتاً حلال ہے۔ اہل مغرب کو تو چھوڑیے، مسلمانوں کو دیکھ لیں، ان کی اکثریت کے ہاں حلال وحرام کا کیا معیار ہے جسے غامدی صاحب اپنے اصول فطرت میں اختلاف کی صورت میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں؟

غامدی صاحب نے انسان کو شارع بنا دیا

غامدی صاحب نے انسانی فطرت کو تحلیل وتحریم کا اختیار تفویض کر کے اس کو شارع بنا دیا ہے اور اللہ کے بالمقابل

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

لا کھڑا کیا ہے۔ اگر انسان کی فطرت کے پاس کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانے کا اختیار ہے تو انسان بھی شارع ہے۔ اور انسان کو شارع بنانا اللہ کے ساتھ اس کو شریک کرنے کے مترادف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ. (الانعام ۶:۱۴۸)

''عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شرک کیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔''

نفی کے سیاق میں اگر نکرہ آئے تو وہ عبارت اپنے عموم میں نص بن جاتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیت بھی اپنے عموم میں نص ہے، یعنی کسی چیز کو بھی حرام قرار دینے کا اختیار انسان کے پاس نہیں ہے۔ ایک آیت میں اس سے بھی زیادہ صراحت سے 'مِنْ دُوْنِہٖ' کے الفاظ کے ساتھ اس مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ. (النحل ۱۶:۳۵)

''اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے شرک کیا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتے اور ہم اس کے بغیر کسی چیز کو بھی حرام نہ ٹھہراتے۔''

یہ آیات اس مسئلے میں صریح نص کا درجہ رکھتی ہیں کہ شارع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور کوئی چیز اس وقت حلال ہو گی جبکہ اللہ تعالیٰ اس کو حلال قرار دے اور اس وقت حرام ہو گی جبکہ اللہ تعالیٰ اس کو حرام قرار دے اور انسان کے پاس کسی بھی چیز کو حرام قرار دینے کا اختیار نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تحلیل و تحریم

غامدی صاحب نے ہر انسان کو تو یہ حق دے دیا کہ اپنی فطرت سے حلال و حرام کی فہرست تیار کرے، لیکن وہ اللہ کے رسول کے پاس یہ اختیار ماننے سے انکاری ہیں۔ غامدی صاحب ''اصول و مبادی'' میں لکھتے ہیں:

''بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر

حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔''

(میزان، جاوید احمد غامدی ۳۸-۳۹)

غامدی صاحب اپنی فطرت کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ قرآنی محرمات (اربعہ) کی فہرست میں جتنا چاہے، اضافہ کر لے۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ آپ کے کسی فرمان سے ان چار قرآنی محرمات کی فہرست میں اضافہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس سے قرآن کا نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی لازم آتی ہے، جو کہ جائز نہیں ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ غامدی صاحب اپنی فطرت سے قرآنی محرمات میں جو اضافہ کر رہے ہیں تو اس سے کیا قرآن کا نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی لازم نہیں آتی ؟ غامدی صاحب اپنی فطرت سے قرآنی حکم کے نسخ، اس میں اضافے اور اس کے مدعا میں تبدیلی کے قائل ہیں، لیکن احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام دینے کو تیار نہیں، کیوں؟ کیا انسانی فطرت کا رتبہ معاذ اللہ، نبوت و رسالت سے بڑھ کر ہے؟

مقدم کون، نورِ فطرت یا نورِ وحی؟

غامدی صاحب کے نزدیک انسانی ہدایت و رہنمائی کے دو بڑے ذریعے ہیں، ایک انسانی فطرت اور دوسرا وحی۔ لیکن ان میں بھی غامدی صاحب فطرت کی رہنمائی کو وحی کی رہنمائی پر مقدم رکھتے ہیں۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دین کی تاریخ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تو اس (یعنی دین) کے بنیادی حقائق ابتدا ہی سے اس کی فطرت میں ودیعت کر دیے، پھر اس کے ابوالآبا حضرت آدم کی وساطت سے اسے بتا دیا گیا کہ...اس کی ضرورتوں کے پیش نظر اس کا خالق وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت اسے بھیجتا رہے گا... چنانچہ پروردگار نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور انسانوں ہی سے کچھ ہستیوں کو منتخب کر کے ان کے ذریعے سے اپنی یہ ہدایت بنی آدم کو پہنچائی، اس میں حکمت (یعنی ایمانیات اور اخلاقیات) بھی تھی اور شریعت بھی۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۴۷)

غامدی صاحب کا یہ نقطۂ نظر قرآنی آیات کے مخالف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے آدم کو اس دنیا میں بھیجا ہے اس دن سے ہی اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری فرما دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ

''ہم نے کہا: تم سب (یعنی آدم اور ان کی ہونے والی ذریت) اس جنت سے اُتر جاؤ، پس اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فِيهَا خَالِدُوْنَ. (البقرہ۲: ۳۸-۳۹)

اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیات کو جھٹلایا وہ لوگ آگ والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى. (طٰہٰ۲۰: ۱۲۳)

''فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) کہ تم دونوں (یعنی سب) اس جنت سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پس اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو نہ تو وہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ ہی (آخرت میں) بد بخت ہوگا۔''

اس انتہائی اہم موقع پر جبکہ حضرت آدم کو اور ان کی آنے والی ذریت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت انھیں صرف ایک ہی چیز کی پیروی کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ اور دونوں جگہ قرآن کے الفاظ 'مِنِّىْ هُدًى' اور اس کا سیاق وسباق بتلاتا ہے کہ اس ہدایت سے مراد کوئی فطری ہدایت نہیں، بلکہ اللہ کی آیات اور اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کی رہنمائی مراد ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ پہلے ہی دن سے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے حضرت آدم اور ان کی آنے والی ذریت کو جو رہنمائی دی جا رہی ہے وہ وحی کی رہنمائی ہے اور جس نے بھی اللہ کی دی ہوئی اس وحی کی رہنمائی سے استفادہ کرنے سے انکار کیا تو وہی لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔

فطرت انسانی سے معروف ومنکر کا تعین

غامدی صاحب کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں 'معروف' اور 'منکر' کا تعین شریعت نہیں، بلکہ فطرت انسانی کرے گی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جس سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع ومانع فہرست پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

بالکل الگ الگ پہچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے۔‘‘

(میزان، جاوید احمد غامدی ۴۸-۴۹)

اگر معروف و منکر شریعت کا موضوع نہیں ہے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟

مَـنْ رَاى مِنكُـمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَـطِـعْ فَبِـلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ . (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النہی عن المنکر من الایمان)

’’جو بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے، اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے دل سے۔‘‘

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم منکر کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دے رہے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے منکرات کا تعین کر دیا ہے۔ اگر غامدی صاحب کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ معروف اور منکر کا تعین فطرت انسانی سے ہوگا تو شریعت اسلامیہ ایک کھیل تماشا بن جائے گی۔ ایک شخص کے نزدیک ایک فعل معروف ہوگا جبکہ دوسرے کے نزدیک وہی فعل منکر ہوگا۔ مثلاً غامدی صاحب کے نزدیک موسیقی معروف کے تحت آئے گی۔ اب غامدی صاحب کو قرآن کا یہ حکم ہے کہ وہ امر بالمعروف کا فریضہ سر انجام دیں یعنی لوگوں کو موسیقی سننے کا حکم دیں جبکہ علما موسیقی کو منکرات میں شامل کرتے ہیں اور علما کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ وہ منکرات کو بزور باز روکیں، یعنی غامدی صاحب کو موسیقی کے جواز کا فتویٰ دینے سے بزور باز روکیں۔

امام رازی، امام ابوبکر جصاص، علامہ سید آلوسی، علامہ ابن حجر ہیثمی، علامہ مناوی، ملا علی القاری، علامہ ابوحیان الاندلسی، امام طبری، امام ابن تیمیہ، امام شوکانی، علامہ ابن الاثیر الجزری، علامہ صاوی اور علامہ عبدالقادر عودہ نے واضح اور صریح الفاظ میں اپنے اس موقف کو بیان کیا ہے کہ معروف و منکر کا تعین شریعت سے ہوگا۔ ان علما وائمہ کی آرا کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے لیے سید جلال الدین عمری کی کتاب ’معروف و منکر‘ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (معروف و منکر، سید جلال الدین عمری ۹۸-۱۱۳)

کیا فطرت انسانی ماخذ شریعت ہے؟

غامدی صاحب عالم اسلام کے وہ پہلے نامور اسکالر ہیں جنھوں نے فطرت انسانی کو مصادر شریعت میں شمار کیا اور اسے حلال و حرام کی تمیز میں میزان قرار دیا۔ امام شافعی سے لے کر امام شوکانی تک کسی بھی اصولی (اصول فقہ کے ماہرین) نے اپنی کتاب میں مصادر شریعت کی بحث میں ’فطرت انسانی‘ کا تذکرہ نہیں کیا۔ علما اور فقہا نے ہر دور میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن، سنت، اجماع اور قیاس وغیرہ جیسے ماخذ شریعت کے ذریعے سے شرعی احکام تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور کسی بھی فقیہ یا عالم نے امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں 'فطرت انسانی' کو کبھی بھی استنباط احکام کے لیے بطور اصول یا ماخذ شریعت بیان نہیں کیا۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نئی فقہ کے ساتھ ساتھ نئی اصول فقہ بھی مرتب کرنے کا شوق پورا فرما رہے ہیں۔ غامدی صاحب اپنا یہ شوق ضرور پورا فرمائیں، لیکن علم و تحقیق کی روشنی میں۔ غامدی صاحب نے 'فطرت انسانی' کو مصدر شریعت تو بنا دیا، لیکن اس کی ان کے پاس دلیل کیا ہے کہ 'فطرت انسانی' مصدر شریعت ہے؟ بلکہ دلیل تو غامدی صاحب کے خلاف قائم ہو رہی ہے۔ عام انسان تو کجا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر اپنی فطرت سے کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ آپ کھانے کی بعض اشیا کو فطرتاً ناپسند کرتے تھے اور انھیں کھانے سے اجتناب کرتے تھے، لیکن آپ نے ان کو حرام قرار نہیں دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے:

اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِضَبٍّ مَشْوِیٍّ فَأَهْوٰی اِلَیْهِ لِیَأْکُلَ فَقِیْلَ لَهٗ اِنَّهٗ ضَبٌّ فَأَمْسَكَ یَدَهٗ فَقَالَ خَالِدٌ اَحَرَامٌ هُوَ قَالَ لَا وَلٰکِنَّهٗ لَا یَکُوْنُ بِأَرْضِ قَوْمِیْ فَأَجِدُنِیْ أَعَافُهٗ فَأَکَلَ خَالِدٌ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْظُرُ.

(صحیح البخاری، کتاب الأطعمہ، باب الشواء)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بھنی ہوئی گوہ لائی گئی۔ آپ اس کو کھانے کے لیے جھکے تو آپ سے کہا گیا کہ یہ گوہ ہے۔ پس آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ حضرت خالد بن ولید نے سوال کیا کہ کیا یہ حرام ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: ''نہیں، لیکن چونکہ یہ جانور میری قوم کی سرزمین (یعنی مکہ) میں نہیں پایا جاتا، اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔'' پس حضرت خالد نے اس کو کھایا اور آپ حضرت خالد کو دیکھ رہے تھے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

اَهْدَتْ خَالَةُ ابْنِ عَبَّاسٍ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ أَقِطًا وَسَمْنًا وَأَضُبًّا فَأَکَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاَقِطِ وَالسَّمْنِ وَتَرَكَ الضَّبَّ تَقَذُّرًا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَأُکِلَ عَلٰی مَائِدَةِ

''حضرت عبداللہ بن عباس کی خالہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ پنیر، گھی اور گوہ ہدیہ کے طور پر بھیجے۔ پس آپ نے پنیر اور گھی کھا لیا اور گوہ سے کراہت کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ گوہ آپ کے دسترخوان پر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَوْ کَانَ حَرَامًا مَا أُکِلَ عَلٰی مَائِدَۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

کھائی گئی، اگر وہ حرام ہوتی تو آپ کے دسترخوان پر نہ کھائی جاتی۔‘‘

(صحیح البخاری، کتاب الھبہ وفضلاہا، باب قبول الہدیہ)

مذکورہ بالا روایات سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کے گوشت کو ناپسند فرمایا۔

۲۔ آپ کے سامنے گوہ کا گوشت کھایا گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

۳۔ کھانے کے ایک جانور سے آپ کی فطرت ابا کر رہی تھی، لیکن آپ نے اسے اپنی فطری ناپسندیدگی کی وجہ سے حرام قرار نہیں دیا۔

۴۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے (یعنی وحی کے بغیر) کسی چیز کو حرام قرار نہیں دے سکتے۔

۵۔ فطرت انسانی اگر ایک چیز سے ابا کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حرام ہے، جیسا کہ غامدی صاحب کہتے ہیں۔

۶۔ تحلیل وتحریم کی اصل بنیاد وحی ہے نہ کہ فطرت انسانی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کے اصول فطرت کی دلیل کا تجزیہ

غامدی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی میں اپنے ایک لیکچر کے دوران میں اپنے تصور فطرت کے حق میں جو دلیل بیان کی ہے۔ وہ سورۃ الشّمس کی درج ذیل آیات ہیں:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰاھَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰاھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰاھَا. (۹۱: ۷-۱۰)

غامدی صاحب اس آیت کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں نیکی اور بدی کا علم رکھ دیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم بوجوہ غلط ہے:

۱۔ یہ مفہوم قرآن کی واضح نص کے خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا

’’اللہ تعالیٰ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے

تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا. (النحل۱۶: ۷۸) | نکالا، اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔''

اسی لیے امام ابن قیم لکھتے ہیں:

لیس المراد بقوله 'یولد علی الفطرة' أنه خرج من بطن أمه بعلم الدین لأن اللّٰه تعالیٰ یقول واللّٰهُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ولکن المراد أن فطرته مقتضیة معرفة دین الاسلام و محبته. (صحیح البخاری مع فتح الباری، کتاب اللباس، باب قص الشارب)	''یُوۡلَدُ عَلَی الۡفِطۡرَةِ' سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے دین کا علم لے کر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے'' بلکہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ انسان کی فطرت دین اسلام کی معرفت اور اس کی محبت کا تقاضا کرتی ہے۔''

۲۔ یہ مفہوم حدیث کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَللّٰهُمَّ آتِ نَفۡسِیۡ تَقۡوَاهَا وَزَکِّهَا اَنۡتَ خَیۡرُ مَنۡ زَکَّاهَا. (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل)	''اے اللہ تعالیٰ، تو میرے نفس کو اس کا تقویٰ (یعنی تقویٰ کی رہنمائی) عنایت فرما دے اور اس کو پاک کر دے، بے شک تو پاک کرنے والوں میں بہترین پاک کرنے والا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اگر 'فجور' اور 'تقویٰ' انسانی فطرت میں داخل ہیں تو اللہ تعالیٰ سے اس تقویٰ کو مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اس آیت کے مفہوم کو واضح کر رہی ہے کہ اس آیت میں 'تَقۡوٰی' سے مراد اس (تقویٰ) کی رہنمائی اور 'فجور' سے مراد اس (فجور) کی پہچان ہے۔

۳۔ یہ مفہوم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر کے خلاف ہے۔ امام طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

قوله: فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا یقول: بین الخیر و الشر.	''ابن عباس 'فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے خیر اور شر کو واضح کر دیا ہے۔''

۴۔ یہ مفہوم جلیل القدر تابعین اور تبع تابعین کی تفسیر کے خلاف ہے۔ امام طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن مجاهد: فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا قال: عرفها.

''حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ 'فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گناہ اور تقویٰ بتلا دیا ہے۔''

عن قتادة: فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا فبين لها فجورها.

''حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ 'فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے تقویٰ اور فجور کو واضح کر دیا ہے۔''

الضحاك يقول في قوله تعالىٰ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا بين لها الطاعة والمعصية.

''حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ 'فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اطاعت اور معصیت کو واضح کر دیا۔''

عن سفيان فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا قال اعلمها المعصية والطاعة.

''حضرت سفیان سے روایت ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اطاعت اور معصیت کے بارے میں بتلایا۔''

جلیل القدر مفسرین امام طبری، امام قرطبی، امام بیضاوی، امام سیوطی، علامہ زمخشری، امام نسفی، امام شوکانی، امام ابن کثیر اور علامہ ابن عطیہ نے بھی اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے جو کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

غامدی صاحب کا اپنے اصول فطرت سے انحراف

جس طرح غامدی صاحب کا اصول فطرت غلط ہے، اسی طرح بعض مقامات پر اس اصول کی تطبیق میں انھوں نے اپنے ہی وضع کردہ اس اصول سے انحراف بھی کیا ہے۔ ان میں سے ایک کو ہم قارئین کے لیے بطور مثال بیان کیے دیتے ہیں۔

مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں ڈاڑھی بھی شامل ہے۔ کسی چیز کی فطرت سے مراد اس کی وہ اصل تخلیق ہے جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس حالت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے پر ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں جبکہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ

ہے کہ ان کے چہرے پر بال نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کی تخلیق میں یہ فطری فرق رکھا ہے۔ ڈاڑھی غامدی صاحب کے اصول فطرت سے ثابت ہے۔ لیکن غامدی صاحب نے اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی اصول فطرت، دونوں کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے ڈاڑھی کو دین سے خارج قرار دیا۔ ڈاڑھی انسانی فطرت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْاَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْإِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ قَالَ زَكَرِيَّا قَالَ مُصْعَبٌ وَنَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةَ. (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب خصال الفطرۃ)

''دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: مونچھوں کو کاٹنا، ڈاڑھی کو چھوڑنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناخنوں کو کاٹنا، انگلیوں کے جوڑوں کا خلال کرنا، بغل کے بال اکھیڑنا، زیر ناف کے بال مونڈنا اور استنجا کرنا۔ زکریا نے کہا کہ مصعب نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا اور میرا خیال ہے کہ وہ کلی کرنا ہے۔''

اس حدیث میں ڈاڑھی رکھنے کو فطرت قرار دیا گیا ہے۔ تمام انبیا کی ڈاڑھی تھی، اس لحاظ سے ڈاڑھی انسانی فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ تمام انبیا کی سنت بھی ہے۔ ابن حجر فطرت کی تشریح میں امام بیضاوی کا قول نقل کرتے ہیں:

قال هی السنة القديمة التی اختارها الأنبياء و اتفقت عليها الشرائع و كأنها أمر جبلی فطروا عليها. (صحیح البخاری مع فتح الباری، کتاب اللباس، باب قص الشارب)

''امام بیضاوی کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد وہ سنت قدیمہ ہے جسے تمام انبیا نے اختیار کیا ہے اور جس پر تمام شریعتوں کا اتفاق ہو گویا کہ فطرت ایک ایسا جبلی معاملہ ہے جس پر انسانوں کی پیدایش ہوئی ہے۔''

ڈاڑھی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ''المورد'' کے ایک ریسرچ اسکالر لکھتے ہیں:

''عام طور پر اہل علم ڈاڑھی رکھنا ضروری قرار دیتے ہیں، تاہم ہمارے نزدیک ڈاڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا۔ لہٰذا دین کی رو سے ڈاڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ اس معاملے میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے برعکس مردوں کے چہرے پر بال اگائے ہیں اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ڈاڑھی رکھنا اپنے لیے پسند کیا۔'' (www.urdu.understanding-islam.org)

یہ عبارت اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ ایک طرف تو اس میں کس ڈھٹائی کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کیا جا رہا

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

ہے کہ ڈاڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بھی بیان نہیں ہوا، حالانکہ بیسیوں احادیث ایسی ہیں جن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین، یہود اور مجوسیوں کی مخالفت میں مسلمانوں کو ڈاڑھی چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ کیا حدیث دین نہیں ہے؟ اگر غامدی صاحب ڈاڑھی کی احادیث کو اس بنا پر رد کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک حدیث سے دین ثابت نہیں ہوتا تو ڈاڑھی تو ان کے اصول سنت سے بھی ثابت ہے اور اصول فطرت سے بھی۔ دوسری طرف ''المورد'' کے مفتی صاحب اس بات کا بھی اقرار کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں میں ایک بنیادی فرق ڈاڑھی کا بھی ہے جو کہ پیدایشی اور فطری فرق ہے۔ تعجب ہے اس انداز فکر پر! جب چاہتے ہیں اپنے مزعومہ افکار کی تائید کے لیے اصول وضع کر لیتے ہیں اور اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لیے جب چاہتے ہیں اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کی بھی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

غامدی صاحب کے تصور 'فطرت' پر اعتراضات کا جائزہ

[یہ مضمون ماہنامہ ''الشریعہ'' کے جولائی ۲۰۰۷ کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ معمولی حک و اضافے کے بعد ''الشریعہ'' کے شکریے کے ساتھ اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''قرآن اکیڈمی'' کے ریسرچ ایسوسی ایٹ حافظ محمد زبیر صاحب کے قلم سے جناب جاوید احمد غامدی کی تصنیف ''اصول و مبادی'' کے بعض اصولی تصورات پر تنقید کا سلسلہ گزشتہ کچھ عرصے سے ماہنامہ ''الشریعہ'' میں جاری ہے۔ ان میں سے بعض مضامین ''قرآن اکیڈمی'' کی طرف سے ''فکر غامدی'' کے زیر عنوان ایک مجموعے کی صورت میں بھی شائع کیے گئے ہیں۔ علمی مباحث میں نقد و تنقید کی روایت کا زندہ رہنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے زیر بحث تصورات کی تنقیح ہوتی ہے اور مختلف اطراف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا ہم ''الشریعہ'' یا بعض دیگر جرائد میں غامدی صاحب کی آرا پر سامنے آنے والی علمی تنقید کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس حسن ظن کے ساتھ اس ضمن میں اپنی معروضات پیش کر رہے ہیں کہ ناقدین نے خیر خواہی اور اصلاح کے جس جذبے کے ساتھ اپنی تنقیدات پیش کی ہیں، اسی طرح ہماری گزارشات پر بھی غور فرمائیں گے اور اگر ان میں کوئی کمزوری پائیں تو علمی اسلوب میں اس کی نشان دہی کریں گے۔

فطرت کا مفہوم اور اس کی رہنمائی کا دائرہ

حافظ محمد زبیر صاحب کے تنقیدی مضامین پر تبصرے کا آغاز ہم ان کے مضمون ''غامدی صاحب کے تصور فطرت کا

تنقیدی جائزہ'' سے کررہے ہیں جو''الشریعہ'' کے فروری ۲۰۰۷ کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں فاضل ناقد نے جو نکات اٹھائے ہیں، ان کو ایک ترتیب سے زیر بحث لایا جائے تو پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کے مابین فرق کو جاننے کے لیے کوئی اساس اور بنیاد موجود ہے؟

جناب جاوید احمد غامدی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر وشر کا احساس انسان کی فطرت میں روز اول ہی سے ودیعت ہے۔اس احساس کی بدولت وہ نیکی اور بدی کو اسی طرح الگ الگ پہچانتا ہے جس طرح آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں۔غامدی صاحب نے اس ضمن میں سورۂ شمس (۹۱) کی آیات 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا' (اور نفس گواہی دیتا ہے، اور جیسا اسے سنوارا، پھر اس کی نیکی اور بدی اسے سجھادی) سے استدلال کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''قرآن نے ان آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ خیر وشر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے دل ودماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔'' (اخلاقیات ۱۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ فطری احساس اس دین کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے جو وحی کے ذریعے سے اسے ملا۔چنانچہ ان کے نزدیک شریعت کے اوامر ونواہی دین فطرت کے عین مطابق اور اسی کی اساس پر مبنی ہیں۔اپنی تصنیف ''اصول ومبادی'' میں لکھتے ہیں:

''... پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی ان حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روز اول سے ودیعت ہیں اور جنھیں قرآن معروف اور منکر سے تعبیر کرتا ہے۔شریعت کے جو اوامر ونواہی تعین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ ان معروفات ومنکرات کے بعد اور ان کی اساس پر قائم ہیں۔انھیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہوگا۔'' (۵۸)

علماے امت کا موقف بھی یہی ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع نے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے واضح کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر وشر اور بھلے برے کی پہچان کے لیے ایک استعداد اور مادہ خود اس کے وجود میں رکھ دیا

ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: 'فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا' یعنی نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ، دونوں کے مادے رکھ دیے ہیں۔'' (معارف القرآن ۷۵۱/۸)

مولانا امین احسن اصلاحی نے تحریر کیا ہے:

''...بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے، بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳۷۵/۹)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مذکورہ آیات کی شرح میں لکھتے ہیں:

''الہام کا لفظ 'لهم' سے ہے جس کے معنی نگلنے کے ہیں۔ 'لَهَمَ الشَّيْءَ وَالْتَهَمَهٗ' کے معنی ہیں فلاں شخص نے اس چیز کو نگل لیا۔ اور 'اَلْهَمْتُهُ الشَّيْءَ' کے معنی ہیں میں نے اس کو فلاں چیز نگلوا دی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفس انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیز گاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی، اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (برائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں، بلکہ اس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اس کو عطا کر دی ہے۔ یہی بات سورۂ بلد میں فرمائی گئی ہے کہ 'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'، ''اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے'' (آیت ۱۰)۔ اسی کو سورۂ دہر میں یوں بیان کیا گیا ہے: 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا'، ''ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر'' (آیت ۳)۔ اور اسی بات کو سورۂ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوامہ (ضمیر) موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے، مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔'' (تفہیم القرآن ۳۵۲/۶)

فاضل ناقد کی تمہیدی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نفس انسانی میں ایک 'فطری رجحان' کے پائے جانے کی حد تک اس بات سے اتفاق ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

''اسلام کے دین فطرت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے بندوں کو جس فعل کے بھی کرنے کا حکم دیا ہے فطرت سلیمہ اس فعل کے کرنے کی طرف ایک فطری رجحان اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور جس فعل کے کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں روک دیا ہے فطرت سلیمہ بھی اس فعل سے ابا محسوس کرتی ہے۔ احکام الٰہی فطرت انسانی کے مطابق تو ہیں لیکن فطرت انسانی سے ان کا تعین نہیں ہو سکتا۔'' (فکر غامدی ۱۵)

اس تحریر میں فاضل ناقد نے اسلام کو دین فطرت قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ احکام الٰہی فطرت انسانی کے مطابق ہیں اور فطرت میں وحی کے احکامات اور ممنوعات کا رجحان ودیعت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فطرت انسانی میں اوامر و نواہی کے احساس اور اوامر کی طرف اس کے میلان اور نواہی سے اس کے ابا کو وحی سے مقدم طور پر تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ کم سے کم اس نکتے کی حد تک ان کی اور غامدی صاحب کی بات میں اساسی لحاظ سے کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے بعد اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ احساس عملاً خیر اور شر کے مابین امتیاز قائم کرنے میں کس حد تک انسان کے لیے کارآمد ہے؟ آیا انسان کی فطرت اس کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی یا اس کے برعکس، وحی کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر ہر لحاظ سے مکمل رہنمائی کی اہلیت رکھتی ہے یا ان دونوں کے بین بین کوئی صورت حال ہے؟

غامدی صاحب کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی فطرت میں دو چیزیں ازل ہی سے ودیعت ہیں۔ ایک اللہ کی ربوبیت کا اقرار ہے اور دوسری خیر و شر یعنی نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ پہلی چیز درحقیقت اس واقعے کا اقرار ہے جو نفوس انسانی کی تخلیق کے موقع پر زمانۂ ازل میں رونما ہوا تھا۔ اس موقع پر تمام نوع انسانی نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ اللہ ہی ان کا پروردگار ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۷۲-۱۷۴ میں اس واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق پروردگار نے تمام انسانوں سے پوچھا تھا کہ 'اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟' ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا: 'بَلٰی، شَهِدْنَا' ''ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں۔'' اس واقعے کی حقیقت انسان کی فطرت میں پوری طرح مسلم ہے۔ دوسری چیز خیر و شر کا شعور ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے تصور کو انسان کی فطرت اور اس کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا ہے۔ سورۂ شمس (۹۱) کی آیات ۷-۱۰، سورۂ دہر (۷۶) کی آیت ۳ اور سورۂ بلد (۹۰) کی آیت ۱۰ سے اسی بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں انسان کا فطری علم اور شعور اس کی بنیادی رہنمائی کی خدمت

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''ایمانیات'' میں لکھتے ہیں:

''دین کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ دنیا کا ایک خالق ہے۔ اس نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ چنانچہ انسان کو یہاں اس نے ایک خاص مدت کے لیے بھیجا ہے۔ اس مدت کے پورا ہو جانے کے بعد یہ دنیا لازماً ختم کر دی جائے گی اور اس کے زمین و آسمان ایک نئے زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔ تمام انسان وہاں دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ان کے عقیدہ وعمل کے لحاظ سے انھیں جزا یا سزا دی جائے گی۔

دین اس حقیقت کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے لیے، ظاہر ہے کہ اس کا مبرہن ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق کے پہلے دن ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص علم وعقل کی بنیاد پر اس کا انکار نہ کرے اور لوگوں کے لیے یہ حقیقت ایسی واضح رہے کہ اس کے منکرین قیامت کے دن اپنا کوئی عذر اللہ کے حضور میں پیش نہ کر سکیں۔

یہ اتمام حجت کس طرح ہوا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ خدا کی ربوبیت کا اقرار ایک ایسی چیز ہے جو ازل ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ معاملہ ایک عہد و میثاق کی صورت میں ہوا ہے۔ اس عہد کا ذکر قرآن ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔ انسان کو یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے یہ واقعہ تو اس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اس کی حقیقت اس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے، اسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اس کی یاددہانی کی جائے تو وہ اس کی طرف اس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اس کے اندر ہی موجود تھا۔ اس نے اسے پا لیا ہے تو اس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پا لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے، ہر شخص مجرد اس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰی، شَهِدْنَا، اَنْ تَقُوْلُوْا	''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور انھیں خود اُن کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ، اَوْ تَقُوْلُوْٓا: اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ، وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ، اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ؟ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (الاعراف ۷: ۱۷۲-۱۷۴)

نے جواب دیا: ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی تھے یا اپنا عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر آپ کیا ان غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ (یہ ہم نے پوری وضاحت کر دی ہے) اور ہم اسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو) اور اس لیے کہ وہ رجوع کریں۔''

یہی معاملہ خیر و شر کا ہے۔ اس کا شعور بھی اسی طرح انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' (اور نفس گواہی دیتا ہے اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی نیکی اور بدی اُسے سجھا دی)۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ' (ہم نے اُسے خیر و شر کی راہ سجھا دی) اور 'هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ' (ہم نے کیا اُسے دونوں راستے نہیں سجھائے) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے پروردگار نے ایک حاسۂ اخلاقی بھی اس کے اندر رکھ دیا ہے جو نیکی اور بدی کو بالکل اسی طرح الگ الگ پہچانتا ہے، جس طرح آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں۔ ہمارے نفس کا یہ پہلو کہ وہ ایک نفس ملامت گر بھی ہے اور دل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی زبان ایک واعظ و ناصح کی طرح برائی کے ارتکاب پر ہم کو برابر ٹوکتی اور سرزنش کرتی رہتی ہے، اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے جس کو جھٹلانے کی جسارت کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی اس شہادت کے بعد جزا و سزا کو جھٹلانا بھی کسی شخص کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ فرمایا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ؟ بَلٰى، قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ

''نہیں، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں، اور نہیں، میں (تمھارے) اِس نفس لوامہ کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اِس کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بَـنَـانَـهٗ، بَـلۡ يُرِيۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِيَفۡجُرَ اَمَامَهٗ، يَسۡـئَـلُ اَيَّانَ يَوۡمُ الۡقِيٰمَةِ، فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ وَخَسَفَ الۡـقَمَرُ، وَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ، يَـقُـوۡلُ الۡاِنۡسَانُ يَوۡمَئِذٍ اَيۡنَ الۡمَفَرُّ؟ كَلَّا، لَا وَزَرَ، اِلٰـى رَبِّكَ يَوۡمَئِذِ الۡمُسۡتَقَرُّ، يُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَـانُ يَـوۡمَـئِـذٍ بِـمَـا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، بَلِ الۡاِنۡسَـانُ عَـلٰـى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ، وَّلَوۡ اَلۡقٰى مَعَاذِيۡرَهٗ. (القیامہ۷۵:۱-۱۵)

ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں، ہم تو اس کی پور پور درست کر سکتے ہیں۔ (نہیں، یہ بات نہیں)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے: قیامت کب آئے گی؟ لیکن اُس وقت، جب دیدے پتھرائیں گے اور چاند گہنائے گا اور سورج اور چاند، (یہ دونوں) اکٹھے کر دیے جائیں گے، تو یہی انسان کہے گا کہ اب کہاں بھاگ کر جاؤں — ہرگز نہیں، اب کہیں پناہ نہیں! اُس دن تیرے رب ہی کے سامنے ٹھیرنا ہو گا۔ اُس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ (نہیں، وہ اِسے نہیں جھٹلا سکتا)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری ۲۰۰۶، ۲۵-۲۷)

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا جانے والا یہ فطری شعور کسی خارجی رہنمائی کے بغیر بھی ازخود اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ چنانچہ جب جنت میں ممنوعہ پھل کھانے کے نتیجے میں آدم وحوا کے ستر ان پر کھل گئے تو انھوں نے فوراً اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ قرآن مجید سے واضح ہے کہ ایسا انھوں نے کسی باقاعدہ 'حکم' کی تعمیل میں نہیں، بلکہ شرم وحیا کے اس فطری احساس کی بنا پر کیا تھا جو اللہ نے ان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۲ کی تفسیر میں اسی بات کی وضاحت کی ہے۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''...وَطَـفِـقَـا يَـخۡـصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثے سے آدم وحوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں، فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا، اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گوتھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۲۳۶)

مولانا مودودی نے بیان کیا ہے:

''انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔''

(تفہیم القرآن ۲/۱۵)

ہابیل اور قابیل کے واقعے سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کے قتل کے بعد جو پشیمانی اور ندامت محسوس کی، اس کا سبب وحی نہیں، بلکہ ایک داخلی احساس تھا جو ظاہر ہے کہ فطرت ہی کی ہدایت پر مبنی تھا۔ مولانا اصلاحی نے اس واقعے کے حوالے سے لکھا ہے:

''...خدا پر ایمان، خدا کی عبادت، عبادت کے لیے اخلاص و تقویٰ کی شرط، عدل کا تصور، قتل نفس کا جرم ہونا، جنت اور دوزخ کا عقیدہ، یہ سب چیزیں انسان کی ابتدائے آفرینش ہی سے اس کو تعلیم ہوئی ہیں۔ ان کا عہد جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور اس کی امت سے لیا ہے، اسی طرح آدم اور ان کی ذریت سے بھی لیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی انسان حق و عدل کے ان تصورات سے بالکل خالی تھا جو اب اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۹۳)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں متعدد مقامات پر مختلف زاویوں سے یہ بات بیان کی ہے کہ نیکی اور بدی کی اساسات فطرت انسانی میں راسخ ہیں اور انسان شریعت اور مذہب سے مقدم طور پر ان سے شناسا ہوتا ہے۔ 'باب اقتضاء التکلیف المجازاۃ' کے زیر عنوان انھوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ انسانوں کو ان کے اعمال پر جزا و سزا ملنا کیوں ضروری ہے؟ اس ضمن میں انھوں نے چار اسباب بیان کیے ہیں: ایک سبب وہ ساخت ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ساخت بذات خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان اعمال صالحہ کو انجام دے۔ دوسرا سبب ملاء اعلیٰ کی جہت سے ہے، چنانچہ جب انسان اچھا کام کرتا ہے تو فرشتوں کی جانب سے اس کے لیے مسرت اور سرور کی شعاعیں نکلتی ہیں اور جب وہ برا کام کرتا ہے تو ان سے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

نفرت اور بغض کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ مجازات عمل کا تیسرا سبب شریعت کا نزول ہے جس کی پسندیدگی کا جذبہ اللہ کی طرف سے انسانوں کے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ چوتھا سبب انبیا کی بعثت اور ان کی طرف ہونے والی وحی کا مشخص اور ممثل ہو جانا ہے۔ یہ اسباب بیان کر کے انھوں نے لکھا ہے:

...اما المجازاة بالوجهين الاولين ففطرة فطر اللّٰه الناس عليها ولن تجد لفطرة اللّٰه تبديلا وليس ذلك الا فى اصول البر والاثم وكلياتها دون فروعها وحدودها وهذه الفطرة هو الدين الذى لا يختلف باختلاف الاعصار، والانبياء كلهم مجمعون عليه ... والمؤاخذة على هذا القدر متحققة قبل بعثة الانبياء وبعدها سواء. (۱/۲۵)

”...پہلی دو جہتوں سے مجازات عمل تو عین وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور فطرت الٰہی میں تم کسی قسم کی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ لیکن یہ صرف بر و اثم کے اصول وکلیات میں ہوتا ہے نہ کہ ان کی فروعات وحدود میں، اور یہ فطرت ہی وہ دین ہے جو زمانوں کی تبدیلی سے تبدیل نہیں ہوتا اور جس پر تمام انبیاے کرام کا اجماع واتفاق ہے۔ ...(دین فطرت کی) اس مقدار پر مواخذہ اور داروگیر انبیا سے قبل بھی ثابت ہے اور ان کی بعثت کے بعد بھی۔“

”اتفاق الناس علیٰ اصول الارتفاقات“ کے زیر عنوان انھوں نے بیان کیا ہے کہ ارتفاقات یعنی انسانی سماج کی تشکیل اور اس کی بقا اور تہذیب کے اصول تمام بنی نوع انسان کے مابین ہمیشہ سے مسلم اور متفق علیہ رہے ہیں۔ اس اتفاق کا سبب ان کے نزدیک فطرت سلیمہ ہے۔ لکھتے ہیں:

اعلم ان الارتفاقات لا تخلو عنها مدينة من الاقاليم المعمورة ولا امة من الامم اهل الامزجة المعتدلة والاخلاق الفاضلة من لدن آدم عليه السلام الى يوم القيامة واصولها مسلمة عند الكل قرنا بعد قرن وطبقة بعد طبقة لم يزالوا ينكرون على من

”جاننا چاہیے کہ آباد ممالک کا کوئی شہر یا دنیا کی کوئی قوم جو معتدل مزاج اور اخلاق فاضلہ کی حامل ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک، ان ارتفاقات (یعنی انسان سماج کی تشکیل اور اس کی بقا اور تہذیب کے اصولوں) سے خالی نہیں ہو سکتی۔ ان ارتفاقات کے اصول سب کے نزدیک نسلاً بعد نسلٍ اور طبقہ در طبقہ مسلم چلے آ رہے ہیں اور ان کی خلاف ورزی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عصاها اشد نكير ويرونها امورا بديهية من شدة شهرتها، ولا يصدنك عما ذكرنا اختلافهم فى صور الارتفاقات وفروعها فاتفقوا مثلا على ازالة نتن الموت وستر سوآتهم ثم اختلفوا فى الصور، فاختار بعضهم الدفن فى الارض وبعضهم الحرق بالنار واتفقوا على تشهير امر النكاح وتمييزه عن السفاح على رؤس الاشهاد ثم اختلفوا فى الصور، فاختار بعضهم الشهود والايجاب والقبول والوليمة وبعضهم الدف والغناء ولبس ثياب فاخرة لا تلبس الافى الولائم الكبيرة واتفقوا على زجر الزناة والسراق ثم اختلفوا، فاختار بعضهم الرجم وقطع اليد وبعضهم الضرب الاليم والحبس الوجيع والغرامات المنهكة ... ولا ينبغى ان يظن انهم اتفقوا على ذلك من غير شىء بمنزلة الاتفاق على ان يتغدى بطعام واحد اهل المشاق والمغارب كلهم وهل سفسطة اشد من ذلك؟ بل الفطرة السليمة حاكمة بان الناس لم يتفقوا عليها مع اختلاف امزجتهم وتباعد بلدانهم وتشتت مذاهبهم واديانهم الا لمناسبة

کرنے والوں کو ہمیشہ بڑی سختی سے منع کرتے رہے ہیں۔ بنی نوع انسان ان ارتفاقات کی انتہائی شہرت کی بنا پر انھیں بدیہی امور خیال کرتے ہیں۔ ان ارتفاقات کی ظاہری صورتوں اوران کی جزئیات کے معاملے میں لوگوں کا اختلاف تمھارے لیے ہماری بات کوتسلیم کرنے میں مانع نہ بنے۔ مثلاً مردوں کی بدبودار اور برہنہ لاشوں کو چھپانے پر ساری دنیا کا اتفاق ہے، گو اس کی صورتوں میں ان کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ مردوں کو زمین میں دفن کرنا پسند کرتے ہیں اور کچھ انھیں جلا دیتے ہیں۔ اسی طرح نکاح کی تشہیر اور لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کر کے بدکاری سے اس کو ممتاز کرنے پر بھی انسانوں کا اتفاق ہے۔ پھر اس کی صورتوں میں اختلاف ہے، پس بعض نے گواہوں اور ایجاب وقبول اور ولیمہ کو پسند کیا اور بعض نے دف بجانے اور گانا گانے کو اور ایسے بڑھیا لباس پہننے کو جو صرف شادی بیاہ کی بڑی تقریبات ہی میں پہنے جاتے ہوں۔ زانیوں اور چوروں کو سزا دینے پر بھی اتفاق ہے، لیکن اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ بعض نے سنگ سار کرنے اور ہاتھ کاٹ دینے کا طریقہ اختیار کیا اور بعض نے سخت پٹائی کرنے، تکلیف دہ قید اور کمر توڑ دینے والے جرمانے عائد کرنے کا۔...اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ سب لوگ ان چیزوں پر کسی سبب کے بغیر یوں متفق ہو گئے جیسے اہل مشرق ومغرب سب ایک ہی طرح کا کھانا کھانے پر متفق ہو جائیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی احمقانہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فطرية منشعبة من الصورة النوعية ومن حاجات كثيرة الوقوع يتوارد عليها افراد النوع ومن اخلاق توجبها الصحة النوعية فى امزجة الافراد.(۴۸/۱)

بات ہوسکتی ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگ اپنے مزاجوں کے اختلاف اور اوطان کے باہمی فاصلوں اور ادیان و مذاہب کے اختلاف وتنوع کے باوجود ان امور پر کسی ایسی فطری مناسبت ہی کی وجہ سے متفق ہوئے ہیں جو ان کی صورت نوعیہ سے پھوٹتی ہے۔ اس اتفاق کا سبب وہ حاجات بھی ہیں جو بنی نوع انسان کو بکثرت پیش آتی ہیں اور وہ اخلاق بھی جن کو افراد کے مزاج میں پیدا کرنے کا تقاضا ان کی صورت نوعیہ کی صحت کرتی ہے۔''

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ''مبحث البرّ والاثم'' کے عنوان کے تحت انھوں نے بیان کیا ہے کہ نیکی کے قوانین اللہ ہی کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں الہام کیے گئے ہیں:

وكما ان الارتفاقات استنبطها اولو الخبرة فاقتدى بهم الناس بشهادة قلوبهم واتفق عليها اهل الارض او من يعتد به منهم فكذلك للبر سنن الهمها الله تعالىٰ فى قلوب المؤيدين بالنور الملكى الغالب عليهم خلق الفطرة بمنزلة ما الهم فى قلوب النحل ما يصلح به معاشها فجروا عليها واخذوا بها وارشدوا اليها وحصوا عليها فاقتدى بهم الناس واتفق عليها اهل الملل جميعها فى اقطار الارض على تباعد بلدانهم واختلاف اديانهم بحكم مناسبة فطرية واقتضاء نوعى

''اور جس طرح ارتفاقات کو اہل بصیرت نے مستنبط کیا اور لوگوں نے اپنے دلوں کی گواہی کی بنا پر ان کی اقتدا کی اور روے زمین کے سب لوگوں نے یا ان لوگوں نے جن کا کوئی اعتبار ہے، ان پر اتفاق کر لیا، اسی طرح برّ (نیکی) کے بھی قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں الہام کیے ہیں جنھیں نور ملکی کی تائید حاصل ہے اور جن پر فطرت کا رنگ غالب ہے، ایسے ہی جیسے شہد کی مکھیوں کے دلوں میں وہ چیزیں الہام کی گئی ہیں جو ان کی صلاح معاش کے لیے ضروری ہیں۔ پس ان لوگوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا، ان پر چلے، دوسروں کی رہنمائی کی اور انھیں ان کے اپنانے کی ترغیب دی، پس لوگوں نے ان کی پیروی کی اور زمین کے تمام اطراف میں، علاقوں کے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ولا يضر ذلك اختلاف صور تلك السنن بعد الاتفاق على اصولها ولا صدود طائفة مخدجة لو تامل فيهم اصحاب البصائر لم يشكوا ان مادتهم عصت الصورة النوعية ولم تمكن لاحكامها وهم فى الانسان كالعضو الزائد من الجسد زواله اجمل له من بقائه. (۵۸/۱)

مابین دوری اور ادیان کے اختلاف کے باوجود، تمام اہل ملل ان پر متفق ہو گئے جس کی وجہ ایک فطری مناسبت اور انسانوں کی نوع کا تقاضا تھا۔ ان طریقوں کے اصولوں پر اتفاق کے بعد ان کی صورتوں میں اختلاف مضر نہیں، اسی طرح کسی ایسے ناقص (فطرت والے) گروہ کا گریز بھی مضر نہیں جن پر اگر اصحاب بصیرت غور کریں تو انھیں کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ ان کا مادہ ہی انسانوں کی صورت نوعیہ کے منافی ہے اور اس کے احکام کے تابع نہیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انسان کے جسم میں کوئی زائد عضو ہو اور جس کو کاٹ دینا اس کے باقی رکھنے سے بہتر ہو۔''

صاحب ''تفہیم القرآن'' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی یہی بات بیان کی ہے:

''فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ''جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی'' (آیت ۵۰)۔ مثلاً حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر مچھلی کو آپ سے آپ تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بئے کو گھونسلا تیار کرنا آ جاتا ہے۔ انسان کو بھی اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیے گئے ہیں۔ انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے اور اس حیثیت سے جو الہامی علم اس کو دیا گیا ہے، اس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔ اس حیثیت سے خدا نے انسان کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پے در پے اکتشافات اور ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ ان ایجادات و اکتشافات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ یکایک کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آ گئی اور اس کی بدولت اس نے کسی چیز کا اکتشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی۔ ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان

کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے، اور اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر وشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے، اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔ اس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب وتمدن میں پایا جانا اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے اور مزید براں یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالق حکیم و دانا نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، کیونکہ جن اجزا سے انسان مرکب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادی نظام چل رہا ہے، ان کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔'' (تفہیم القرآن ۶/ ۳۵۲)

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وحی سے مقدم طور پر فطری رہنمائی کا وجود اکابر علماے امت کے نزدیک اسی طرح مسلم ہے جیسا کہ جناب جاوید احمد غامدی نے اسے بیان کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خالق کی معرفت اور خیر وشر کا احساس اور شعور انسان کی فطرت میں مسلم ہے تو وہ کیا ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ شروع کیا؟ غامدی صاحب کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیر وشر کے مبادیات کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کو براہ راست ودیعت کر رکھا تھا، مگر ان کے لوازم و اطلاقات اور جزئیات وتفصیلات میں انسان کو مزید رہنمائی کی ضرورت تھی۔ مزید براں اشخاص، زمانے اور حالات کے فرق کی وجہ سے ان لوازم و اطلاقات اور جزئیات وتفصیلات میں اختلافات کا پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں بھیجنے کے بعد وحی کا سلسلہ جاری فرمایا اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے ان کی ہدایت کا سامان کیا۔ چنانچہ اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''اخلاقیات'' میں لکھتے ہیں:

''(فطرت میں ودیعت خیر وشر کے) اس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس کی گنجایش بھی اس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر وشر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ ان پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اس کی تصدیق کرتی ہے اور انسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم، قوانین حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم، سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل ورذائل اس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو

جاتے ہیں۔

روایتوں میں ایک تمثیل کے ذریعے سے یہی بات اس طرح سمجھائی گئی ہے کہ تم جس منزل تک پہنچنا چاہتے ہو، اس کے لیے ایک سیدھا راستہ تمھارے سامنے ہے جس کے دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ دونوں میں دروازے کھلے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اندر آ جاؤ اور سیدھے چلتے رہو۔ اس کے باوجود کوئی شخص اگر دائیں بائیں کے دروازوں کا پردہ اٹھانا چاہے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے: خبردار، پردہ نہ اٹھانا۔ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ فرمایا ہے کہ یہ راستہ اسلام ہے، دیواریں اللہ کے حدود ہیں، دروازے اس کی قائم کردہ حرمتیں ہیں، اوپر سے پکارنے والا منادی خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر بندۂ مومن کے دل میں ہے اور راستے کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ، وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹)

''بے شک، یہ قرآن اُس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور اپنے ماننے والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں، اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''''

(۱۲)

اس اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک فطرت کو کیا مقام حاصل ہے اور اس کے تقابل میں وحی کی کیا حیثیت ہے۔ فطرت کی ہدایت اور وحی کی ہدایت میں یہی وہ باہمی تعلق ہے جسے امت کے جلیل القدر علما نے بھی بیان کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

أن اصل بعثة الانبياء وان كان لتعليم وجوه العبادات اولا وبالذات لكنه قد تنضم مع ذلك ارادة اخمال الرسوم الفاسدة والحث على وجوه من الارتفاقات، وذلك قوله صلى الله عليه وسلم: 'بعثت لمحق المعازف'. وقوله عليه الصلاة والسلام: 'بعثت

''انبیا کی بعثت اصلاً اور بالذات اگرچہ عبادات کے رسوم اور طریقے سکھانے کے لیے ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ بسا اوقات فاسد معاشرتی رسوم کا خاتمہ اور ارتفاقات کی بعض صورتوں پر لوگوں کو آمادہ کرنا بھی بطور مقصد کے شامل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ مجھے گانے بجانے کے آلات کو ختم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لاتمم مكارم الاخلاق؛ ... والذى أتى به الانبياء قاطبة من عند الله تعالىٰ فى هذا الباب هو ان ينظر الى ما عند القوم من آداب الاكل والشرب واللباس والبناء ووجوه الزينة ومن سنة النكاح وسيرة المتناكحين ومن طرق البيع والشراء ومن وجوه المزاجر عن المعاصى وفصل القضايا ونحو ذلك. فان كان الواجب بحسب الرأى الكلى منطبقا عليه فلا معنى لتحويل شىء منه من موضعه ولا العدول عنه الى غيره بل يجب ان يحث القوم على الاخذ بما عندهم وان يصوب رأيهم فى ذلك ويرشدوا الى ما فيه من المصالح وان لم ينطبق عليه ومست الحاجة الى تحويل شىء او اخماله لكونه مفضيًا الى تأذى بعضهم من بعض او تعمقًا فى لذات الحياة الدنيا واعراضًا عن الاحسان او من المسليات . التى تؤدى الى اهمال مصالح الدنيا والآخرة ونحو ذلك فلا ينبغى ان يخرج الى ما يباين مألوفهم بالكلية بل يحول الى نظير ما عندهم.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۱۰۴)

مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔...اس باب میں تمام کے تمام انبیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو طریقہ لے کر آئے، وہ یہ تھا کہ اس قوم کے ہاں کھانے پینے، لباس، تعمیر، زیب و زینت، نکاح اور زوجین کے باہمی معاملات، بیع وشرا کی جو بھی صورتیں موجود ہوں اور گناہوں سے روکنے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے جو بھی طریقے رائج ہوں، اگر وہ کلی رائے کے اعتبار سے عائد ہونے والی ذمہ داری کے موافق ہوں تو ان میں سے کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹانے یا اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ اس قوم کو ان کے ہاں رائج طریقوں ہی کی پابندی کی ترغیب دی جائے اور اس معاملے میں ان کی رائے کی تصویب کی جائے اور اس میں جو مصالح پائے جاتے ہیں، وہ ان پر واضح کیے جائیں۔ البتہ اگر کوئی چیز اس کے موافق نہ ہو اور اس کو بدلنے یا ختم کر دینے کی ضرورت ہو، یا اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کی باہمی اذیت کا سبب بنتی ہے یا دنیا کی لذتوں میں کھو جانے اور احسان کے طریقے سے اعراض کا باعث ہے یا ایسی غفلت پیدا کرتی ہے جس سے دنیا اور آخرت کے مصالح برباد ہو جاتے ہیں تو پھر بھی اس قوم کے مانوس طریقوں سے بالکلیہ باہر نکل جانا درست نہیں، بلکہ اس کو تبدیل کر کے انھی کے ہاں موجود کسی نظیر کو اپنانا چاہیے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مولانا امین احسن اصلاحی نے بیان کیا ہے:

''انسان انبیاے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا، بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ اس راہ میں اس کو اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے، جن کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں، بہت سے مغالطے پیش آ سکتے تھے، نیز مبادی فطرت کے تمام لوازم اور ان کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی و رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انھی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں، اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے، انھوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا۔ صرف ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی جنھوں نے اپنی فطرت مسخ کر ڈالی تھی، اگرچہ اپنے دلوں کے اندر وہ بھی رسولوں کی صداقت و حقانیت کے معترف رہے۔''

(تدبر قرآن ۶/ ۹۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ساخت اور تراش شروع سے ایسی رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سمجھنا اور قبول کرنا چاہے تو کر سکے اور بدء فطرت سے اپنی اجمالی معرفت کی ایک چمک اس کے دل میں بطور تخم ہدایت کے ڈال دی ہے کہ اگر گردوپیش کے احوال اور ماحول کے خراب اثرات سے متاثر نہ ہو اور اصلی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً دین حق کو اختیار کرے، کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔ ''عہد الست'' کے قصہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ ہر بچہ فطرۃ (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے بعدہٗ ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو ''حُنفاء'' پیدا کیا۔ پھر شیاطین نے اغوا کر کے انھیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔ بہر حال دین حق، دین حنیف اور دین قیم وہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی فطرت پر مخلی بالطبع چھوڑ دیا جائے تو اپنی طبیعت سے اسی کی طرف جھکے۔ تمام انسانوں کی فطرۃ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بنائی ہے جس میں کوئی تفاوت اور تبدیلی نہیں۔ فرض کرو اگر فرعون یا ابو جہل کی اصلی فطرت میں یہ استعداد اور صلاحیت نہ ہوتی تو ان کو قبول حق کا مکلّف بنانا صحیح نہ ہوتا۔ جیسے اینٹ پتھر یا جانوروں کو شرائع کا مکلّف نہیں بنایا۔ فطرت انسانی کی اسی یکسانیت کا یہ اثر ہے کہ دین کے بہت سے اصول مہمہ کو کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً سب انسان تسلیم کرتے ہیں، گو ان پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہتے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ سب کا مالک حاکم، سب سے نرالا، کوئی اس کے برابر نہیں، کسی کا زور اس پر نہیں، یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ اس پر چلنا چاہیے۔ ایسے ہی کسی کے جان و مال کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا، ہر کوئی برا جانتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دغا نہ کرنا، ہر کوئی اچھا جانتا ہے۔ اس (راستہ) پر چلنا وہ ہی دین سچا ہے۔ (یہ امور فطری تھے، مگر) ان کا بندوبست پیغمبروں کی زبان

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سے اللہ تعالیٰ نے سکھلا دیا۔'' (تفسیر عثمانی ۵۲۸)

اعتراضات کا جائزہ

غامدی صاحب کے موقف اور دلائل کی تفصیلی وضاحت کے بعد اب اس پر فاضل ناقد کے اعتراضات کا جائزہ لیجیے:

فاضل ناقد کا موقف یہ ہے کہ فطرت وحی کے ذریعے سے ملنے والی تعلیمات کو سمجھنے کی حد تک بنیاد کا کام تو دیتی ہے، لیکن بذات خود کسی بھی درجے میں کوئی ایسا ذریعۂ ہدایت نہیں ہے جسے من جانب اللہ تصور کیا جائے، بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے روز اول ہی سے انسان کی رہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے جب سے آدم کو اس دنیا میں بھیجا ہے اس دن سے ہی اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری فرما دیا ہے۔... اس انتہائی اہم موقع پر جب کہ حضرت آدم کو اور ان کی آنے والی ذریت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت انھیں صرف ایک ہی چیز کی پیروی کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ اور دونوں جگہ قرآن کے الفاظ 'منی ھدی' اور اس کا سیاق وسباق بتلاتا ہے کہ اس ہدایت سے مراد کوئی فطری ہدایت نہیں، بلکہ اللہ کی آیات اور اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کی رہنمائی مراد ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ پہلے ہی دن سے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے حضرت آدم اور ان کی آنے والی ذریت کو جو رہنمائی دی جا رہی ہے وہ وحی کی رہنمائی ہے اور جس نے بھی اللہ کی دی ہوئی اس وحی کی رہنمائی سے استفادہ کرنے سے انکار کیا تو وہی لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔'' (فکر غامدی ۲۴-۲۵)

فاضل ناقد نے انسان کے فطری علم کے کسی بھی درجے میں رہنما ہونے کی نفی پر دو مزید دلائل بھی پیش کیے ہیں:

ایک یہ کہ یہ بات سورۂ نحل (۱۶) کی آیت ۷۸ کے خلاف ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں میں سے اس حال میں نکالا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ آیت یہ ہے:

وَاللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡ بُطُوۡنِ اُمَّھٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا. (النحل ۱۶: ۷۸)	''اللہ تعالیٰ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔''

دوسرے یہ کہ یہ مفہوم مسلم کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا نقل ہوئی کہ 'اللّٰھم آت نفسی تقواھا'، ''پروردگار، میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما''۔ اس پر انھوں نے لکھا ہے کہ اگر 'فجور'

اور 'تقویٰ' انسانی فطرت میں داخل تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے اللہ سے مانگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

فاضل ناقد کے ان استدلالات کے جواب میں ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

۱۔ بنی آدم کے لیے روز اول سے سلسلۂ وحی جاری کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کا فطری علم کسی بھی درجے میں اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا اور یہ کہ انسان ہر معاملے میں 'وحی' ہی کی رہنمائی کا محتاج ہے۔ ہم اوپر کی سطور میں مختلف دلائل اور اکابر اہل علم کے اقتباسات کی روشنی میں اس نکتے کی تفصیلی وضاحت کر چکے ہیں۔

۲۔ سورۂ نحل کی جس آیت (اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیئا) سے فاضل ناقد نے فطری رہنمائی کی نفی پر استدلال کیا ہے، اس کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہاں انسان کے اندرون یعنی اس کے وجدان اور اس کے نفسی، روحانی اور فطری وجود کا مسئلہ سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے۔ یہاں اس کا بیرون زیر بحث ہے جس سے وہ اپنی عقل، اپنے حواس اور اپنی سماعت و بصارت کے ذریعے سے متعلق ہوتا ہے۔ اس مقام پر مخاطبین کو اللہ کے ان انعامات کی یاددہانی کرائی گئی ہے جن سے وہ اللہ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کے توسط ہی سے آگاہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلۂ بیان میں جو آیت ۶۵ سے شروع ہو کر آیت ۸۳ پر مکمل ہوتا ہے، اس بارش کا ذکر کیا ہے جو بنجر زمین میں روئیدگی پیدا کرتی اور اس کے ثمر آور ہونے کا باعث بنتی ہے، ان چوپایوں کا ذکر کیا ہے جن سے دودھ جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے، کھجوروں اور انگوروں جیسے پھلوں کا ذکر کیا ہے جو لذت کام و دہن کا سامان کرتے ہیں، شہد کی مکھی کا ذکر کیا ہے جو اپنے رب کے حکم سے پھلوں کا رس چوستی اور صحت بخش مشروب پیدا کرتی ہے، بیویوں، بیٹوں اور پوتوں کا ذکر کیا ہے، رزق کا ذکر کیا ہے، فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کا ذکر کیا ہے، گھروں کا ذکر کیا ہے جو چین اور سکون حاصل کرنے کے لیے انسان کی آماج گاہ ہیں، جانوروں کی کھال اور اون کا ذکر کیا ہے جن سے اشیاے ضرورت تیار ہوتی ہیں۔ انھی انعامات کی یاددہانی کراتے ہوئے یہ بھی واضح کیا ہے کہ جب اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں سے نکالا تو تم اپنے گردوپیش میں بکھرے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات سے ناواقف اور بے گانہ تھے۔ پھر اللہ نے تمھیں سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں عطا فرمائیں اور ان کے ذریعے سے تم اس قابل ہوئے کہ گردوپیش کے انعامات سے مستفید ہو سکو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایسی کوئی چیز زیر بحث ہی نہیں ہے جس کا تعلق انسان کے نفسی و روحانی وجود سے ہو۔ نہ ایمان و عقیدے کا ذکر ہے، نہ فضائل اخلاق کا تذکرہ ہے، نہ اس کے رذائل کا بیان ہے، اور نہ حلال و حرام، معروف و منکر، نیکی و بدی، فجور و تقویٰ اور خیر و شر کا حوالہ ہے۔ اس لیے اس سے خیر و شر کے اس فطری

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الہام کی نفی ثابت کرنا درست نہیں ہے جس کا ذکر سورۂ شمس کی آیت 'فالھمھا فجورھا وتقواھا' میں کیا گیا ہے اور جس کے وجود کو ایک 'فطری رجحان' کی حد تک خود فاضل ناقد بھی تسلیم کرتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر سورۂ نحل کی زیر بحث آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

ثم ذكر تعالىٰ منته على عباده فى اخراجه اياهم من بطون امهاتهم لا يعلمون شيئا ثم بعد هذا يرزقهم السمع الذى يدركون الاصوات والابصار التى بها يحسون المرئيات والافئدة وهى العقول التى مركزها القلب على الصحيح وقيل الدماغ والعقل يميز بين الاشياء ضارها ونافعها وهذه القوى والحواس تحصل للانسان على التدريج قليلا قليلا كلما كبر زيد فى سمعه وبصره وعقله حتى يبلغ اشده. وانما جعل تعالىٰ هذه فى الانسان ليتمكن بها من عبادة ربه تعالىٰ. (تفسیر ابن کثیر ۱۳۲/۳)

''پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے اس احسان کا تذکرہ کیا کہ اس نے لوگوں کو ماؤں کے پیٹوں سے نکالا۔ یہ محض نادان تھے، پھر انھیں کان دیے جن سے آوازیں سنیں، آنکھیں دیں جن سے مناظر دیکھیں، دل دیے جس سے سوچیں سمجھیں، عقل کی جگہ دل ہے اور دماغ بھی کہا گیا ہے۔ عقل ہی نقصان دہ اور نفع بخش اشیا میں فرق کرتی ہے۔ یہ قویٰ اور یہ حواس انسان کو بتدریج تھوڑے تھوڑے ہو کر ملتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ہی ساتھ اس کی قوت سماعت، بصارت اور عقل میں بڑھوتری بھی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی پختہ عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ چیزیں محض اس لیے پیدا کیں تا کہ وہ اپنی ان طاقتوں کو اللہ کی (معرفت اور) عبادت میں لگائے رکھے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''یعنی انسان جب پیدا ہوتا ہے تو صرف ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے، عقل و علم اور قوت و صلاحیت سے بالکل عاری۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو سمع و بصر اور دل و دماغ کی قوتیں عطا فرماتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴۳۲/۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی نے نہایت تفصیل سے یہی بات بیان کی ہے:

''یعنی پیدایش کے وقت تم کچھ جانتے اور سمجھتے نہ تھے، خدا تعالیٰ نے علم کے ذرائع اور سمجھنے والے دل تم کو دیے جو بذات خود بھی بڑی نعمتیں ہیں اور لاکھوں نعمتوں سے متمتع ہونے کے وسائل ہیں۔ اگر آنکھ، کان، عقل وغیرہ نہ ہو تو ساری ترقیات کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ جوں جوں آدمی کا بچہ بڑا ہوتا ہے، اس کی علمی و عملی قوتیں بتدریج بڑھتی

www.javedahmadghamidi.net

جاتی ہیں۔اس کی شکرگزاری یہ تھی کہ ان قوتوں کو مولیٰ کی طاعت میں خرچ کرتے، اور حق شناسی میں سمجھ بوجھ سے کام لیتے، نہ یہ کہ بجائے احسان ماننے کے الٹے بغاوت پر کمر بستہ ہو جائیں اور منعم حقیقی کو چھوڑ کر اینٹ پتھروں کی پرستش کرنے لگیں۔ یعنی جیسے آدمی کو اس کے مناسب قویٰ عنایت فرمائے، پرندوں میں ان کے حالات کے مناسب فطری قوتیں ودیعت کیں۔...حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی ایمان لانے میں بعضے اٹکتے ہیں، معاش کی فکر سے، سو فرمایا کہ ماں کے پیٹ سے کوئی کچھ نہیں لاتا۔ کمائی کے اسباب کہ آنکھ، کان، دل وغیرہ ہیں، اللہ ہی دیتا ہے اور اڑتے جانور ادھر میں آخر کس کے بھروسا رہتے ہیں۔''...اگر خدا تعالیٰ آنکھ، کان اور ترقی کرنے والا دل و دماغ نہ دیتا، کیا یہ سامان میسر آ سکتے تھے۔...یعنی دیکھو! کس طرح تمھاری ہر قسم کی ضروریات کا اپنے فضل سے انتظام فرمایا اور کیسی علمی و عملی قوتیں مرحمت فرمائیں جن سے کام لے کر انسان عجیب و غریب تصرفات کرتا رہتا ہے، پھر کیا ممکن ہے کہ جس نے مادی اور جسمانی دنیا میں اس قدر احسانات فرمائے، روحانی تربیت و تکمیل کے سلسلہ میں ہم پر اپنا احسان پورا نہ کرے گا۔'' (تفسیر عثمانی ۳۵۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''یعنی وہ ذرائع جن سے تمھیں دنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دنیا کے کام چلا سکو۔ انسان کا بچہ پیدایش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے اتنا کسی جانور کا نہیں ہوتا۔ مگر یہ صرف اللہ کے دیے ہوئے ذرائع علم (سماعت، بینائی، اور تعقل و تفکر) ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجودات ارضی پر حکمرانی کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن ۲/۵۹۹)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ یہاں انسان کو ملنے والی وہ صلاحیتیں مراد ہیں جو اس کے خارج کو اس پر آشکار کرتی اور جن کے ذریعے سے وہ اپنے گردوپیش میں بکھری ہوئی اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ یہاں انسان کی پیدایش کے وقت اس علم کی نفی ہوئی ہے جو انسان کو حواس اور مشاہدات کے ذریعے سے خارجی دنیا کے بارے میں حاصل ہوتا ہے، اس کے فطری علم کی یہاں ہرگز نفی نہیں کی گئی۔

فاضل ناقد نے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ غامدی صاحب کی رائے صحیح مسلم کی ایک روایت کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے حسب ذیل روایت نقل کی ہے:

كان يقول ... اللّٰهم آت نفسي تقواها وزكها أنت خير من زكاها. (مسلم، رقم ۲۷۲۲)	''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ، تو میرے نفس کو اس کا تقویٰ عنایت فرما دے اور اس کو پاک کر دے۔ بے شک، تو پاک کرنے

والوں میں بہترین پاک کرنے والا ہے۔''

روایت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ دعا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کے تقوے اور اس کی پاکیزگی کی طلب میں پروردگار کے حضور میں پیش کی ہے۔ فاضل ناقد نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ استدعا اس چیز کے لیے کی جاتی ہے جو میسر نہ ہو۔ اگر نفس کا تقویٰ انسان کو فطری طور پر ودیعت ہوتا تو آپ اسے اللہ تعالیٰ سے ہرگز طلب نہ کرتے۔ لکھتے ہیں:

''اگر 'فجور' اور 'تقویٰ' انسانی فطرت میں داخل ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس تقویٰ کو مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟''
(فکر غامدی ۲۹)

اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ یہ بات کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ دعا سے اس چیز کی عدم دستیابی لازم آتی ہے جس چیز کے لیے دعا مانگی جا رہی ہے۔ بلاشبہ ناحاصل کے لیے دعا مانگی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم حاصلات کے لیے بھی پروردگار کے حضور میں دست دعا بلند کرتے ہیں۔ اس سے مقصود اس حاصل میں ازدیاد اور اس کا دوام واستمرار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر صالح مسلمان صراط مستقیم پر گام زن رہنے کے باوجود دن میں پانچ مرتبہ 'اهدنا الصراط المستقیم' کی دعا مانگتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعا انسان کی خود ساختہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پروردگار نے سکھائی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صراط مستقیم پر گام زن ہو سکتا ہے، مگر اس کے باوجود ان کی زبان پر یہ دعا جاری رہتی تھی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کیا فطرت مستقل ماخذ دین ہے؟

فطرت اور وحی کے باہمی تعلق کے حوالے سے ان بنیادی مباحث کی وضاحت کے بعد اب آیئے اس سوال کی طرف کہ کیا فطرت کو ایک الگ اور مستقل بالذات ماخذ دین کی حیثیت حاصل ہے؟ اس سوال کا جواب اگر اثبات میں ہے تو پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا تعین کیسے ہوگا اور اگر اس ضمن میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو اسے کیسے رفع کیا جائے گا؟ ہم نے اوپر کے صفحات میں جو بحث کی ہے، اس کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے معاملے کو محض فطرت کی رہنمائی پر منحصر نہیں رکھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انبیا علیہم السلام کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے۔ ان انبیاے کرام نے دین فطرت کی تصویب وتائید کی ہے اور انسانوں کو اس کے حقائق کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان اختلافات کو بھی رفع کیا ہے جو فطرت کے تقاضوں کے فہم میں پیدا ہوئے تھے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انبیا کی

رہنمائی کی موجودگی میں فطرت مستقل ماخذ دین کی حیثیت نہیں رکھتی۔فطرت کی تعیین انبیا کی تائیدوتصویب ہی سے ہوتی ہے اوراس کی تعیین کے لیے وحی کی رہنمائی سے آزاد کوئی الگ اور مستقل معیار موجودنہیں ہے۔یہی موقف ہے جسے جناب جاوید احمد غامدی نے بیان کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''پہلی چیز (یعنی دین فطرت) کا تعلق ایمان واخلاق کے بنیادی حقائق سے ہے اوراس کے ایک بڑے حصے کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔یعنی وہ باتیں جوانسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اورانھیں براسمجھتی ہے۔قرآن ان کی کوئی جامع ومانع فہرست پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے،اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کواپنائے اور منکر کوچھوڑ دے...اس معاملے میں اگرکسی جگہ اختلاف ہوتو ذریت ابراہیم کا رجحان فیصلہ کن ہوگا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے پیغمبرانھی میں آئے ہیں اور معروف ومنکر سے متعلق ان کے رجحانات کوگویا انبیاعلیہم السلام کی تصویب حاصل ہوگئی ہے۔''

(اصول ومبادی ۵۴)

انبیاعلیہم السلام کی طرف سے ذریت ابراہیم کے رجحانات کی تصویب کاعمل آخری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہوا ہے۔اس کے بعد فطرت کے تعین میں اصل معیار کی حیثیت اس 'تصویب' ہی کو حاصل ہے اوراس کو جاننے کے لیے قرآن مجید کوحتمی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔چنانچہ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''(دین فطرت کے) اس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہوسکتے تھے۔اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس کی گنجایش بھی اس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیروشرکو بالکل واضح کردیا ہے۔ان پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اس کی تصدیق کرتی ہے اورانسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم،قوانین حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم،سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل ورذائل اس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہوجاتے ہیں۔''(اخلاقیات ۱۲)

مذکورہ اقتباسات سے واضح ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک فطرت کے تعین کے سلسلے میں فیصلہ کن اتھارٹی کی حیثیت انبیا ہی کو حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ غامدی صاحب نے ''اصول ومبادی'' میں فطرت کا ذکرقرآن مجید کی دعوت کوسمجھنے میں معاون ایک ذریعے کے طور پر تو کیا ہے،لیکن کہیں بھی اسے مستقل بالذات ماخذ دین کے طور پر

www.javedahmadghamidi.com

پیش نہیں کیا، ورنہ وہ ''مبادی تدبر قرآن''، ''مبادی تدبر سنت'' اور ''مبادی تدبر حدیث'' کی طرح ''مبادی تدبر فطرت'' کا بھی باقاعدہ عنوان قائم کرتے اور اس کے تحت فطرت اور اس کے تقاضوں کی تعیین کے اصول وضوابط بیان کرتے۔

تاہم فاضل ناقد کا خیال ہے کہ غامدی صاحب وحی کی تصویب سے بے نیاز ہو کر فطرت کو ایک الگ اور مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے جو مفروضات قائم کیے ہیں، ان پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس نکتے کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے جو فاضل ناقد کے لیے غلط فہمی کا باعث بنا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ، فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ. (الانعام ۶:۱۴۵)

''کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو میری طرف آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز جسے وہ کھاتا ہے، حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سؤر کا گوشت، اس لیے کہ یہ سب ناپاک ہیں یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ۔''

قرآن مجید کی اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چار چیزوں کے علاوہ کھانے کی کوئی بھی چیز حرام نہیں ہے، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث میں کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے کی ممانعت بھی ثابت ہے۔ دونوں حکم بظاہر متعارض معلوم ہوتے ہیں اور علماے امت مختلف زاویوں سے ان کے مابین تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کی رائے میں قرآن کی بیان کردہ چار چیزیں ہی حرام ہیں اور ان کے علاوہ باقی کسی چیز کو حرام نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے صحیح بخاری میں یوں منقول ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول گھریلو گدھے کے گوشت کی ممانعت کو حرمت پر محمول نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ بات 'قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما' کے منافی تھی۔ (بخاری، رقم ۵۲۰۹۔ المستدرک، رقم ۳۲۳۶۔ ابوداؤد، رقم ۳۸۰۰، ۳۸۰۸)

اسی رائے کو بعد میں فقہاے مالکیہ نے اختیار کیا، چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بیان ہونے والے جانوروں کو حرمت پر نہیں، بلکہ کراہت پر محمول کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جمہور فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ کھانے کی اشیا میں ممانعت صرف ان چار چیزوں میں منحصر نہیں، بلکہ بہت سی دیگر اشیا بھی حرام اور ممنوع ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ حصر کا صحیح محل واضح ہوئے بغیر تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ جناب جاوید احمد غامدی نے اسی اشکال کو حل کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قرآن کی بیان کردہ حرمت کا دائرہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حرام قرار دیے جانے والے جانوروں کا دائرہ، دونوں بالکل الگ الگ ہیں اور قرآن مجید نے جس دائرے میں حرمت کو چار چیزوں میں منحصر قرار دیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حرمت کے دوسرے دائرے میں بھی کوئی چیز ممنوع قرار نہ پائے۔ ''اصول ومبادی'' میں اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو جانور پیدا کیے ہیں، ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں۔ یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے، اس لیے ان سے ابا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت وحرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں، اگر تذکیے کے بغیر مر جائیں تو ان کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ انھی جانوروں کا خون کیا ان کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اسے حلال وطیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ ان سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ 'قل لا أجد فی ما أوحی الی' اور بعض جگہ 'انما' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں

حرام قرار دی ہیں... بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔''

(۳۹-۴۱-۴۳)

مذکورہ اقتباس سے واضح ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں اصل بنیاد کی حیثیت قرآن مجید کے بیان کردہ اصول 'اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ' (تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہیں) کے مطابق ان کے خبیث یا طیب ہونے کو حاصل ہے۔ ان طیبات اور خبائث سے انسان اپنی فطرت کی رو سے بالعموم واقف رہا ہے، البتہ ان میں سے ان چیزوں کی شریعت نے وضاحت کر دی ہے جن میں انسان کے لیے اپنی فطرت کی رہنمائی میں فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا، جبکہ باقی جانوروں کے بارے میں انسان کے فطری علم پر اعتماد کرتے ہوئے اس بات کا فیصلہ اس کی فطرت ہی کے سپرد کر دیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غامدی صاحب کا یہ نقطۂ نظر اپنے بنیادی نکات کے لحاظ سے جمہور اہل علم کے موقف سے کسی طرح مختلف نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ سورۂ مائدہ کی آیت 'اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ' (تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہیں) اور سورۂ اعراف کی آیت 'وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ' (یہ پیغمبر ان کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھیراتا ہے) میں طیبات اور خبائث سے مراد کیا ہے۔ اس سوال کے ظاہر ہے کہ دو ہی جواب ہو سکتے ہیں:

۱۔ ان سے مراد صرف وہ چیزیں ہیں جو حلت وحرمت کے حوالے سے شریعت میں بیان ہوئی ہیں۔

۲۔ ان سے مراد وہ چیزیں ہیں جنھیں انسان کی فطرت پسند کرتی یا جن سے وہ ابا کرتی ہے۔

امت کے جلیل القدر اہل علم نے اس سوال کے جواب میں بالعموم دوسری رائے کو اختیار کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ طیبات اور خبائث سے مراد وہ چیزیں ہیں جنھیں انسانی فطرت طیب اور خبیث سمجھتی ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں:

ویحل لهم الطیبات: من الناس من | ''ویحل لهم الطیبات: بعض لوگوں نے کہا ہے

قال المراد بالطيبات الأشياء التي حكم اللّٰه بحلها وهذا بعيد لوجهين: الاول: ان على هذا التقدير تصير الآية ويحل لهم المحلات وهذا محض التكرير. الثاني: ان على هذا التقدير تخرج الآية عن الفائدة، لانا لا ندرى ان الاشياء التي احلها اللّٰه ما هى وكم هى؟ بل الواجب ان يكون المراد من الطيبات الاشياء المستطابة بحسب الطبع وذلك لاان تناولها يفيد اللذة، والاصل فى المنافع الحل فكانت هذه الآية دالة على ان الاصل فى كل ما تستطيبه النفس ويستلذه الطبع الحل الا لدليل منفصل.

...واقول: كل ما يستخبثه الطبع وتستقذره النفس كان تناوله سببا للألم. (تفسیر کبیر ۱۵/ ۲۴)

کہ طیبات سے مراد وہ اشیا ہیں جن کے حلال ہونے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، مگر یہ بات دو پہلوؤں سے بعید ہے۔ ایک یہ کہ اگر اس کا معنی یہ ہوتا تو پھر الفاظ یہ ہوتے کہ 'ویحل لهم المحلات' (اور پیغمبران کے لیے حلال چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے) اور یہ محض تکرار ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ معنی لینے سے آیت فائدے سے خالی ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ جن اشیا کو اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے، وہ کیا ہیں اور کتنی ہیں۔ لازم ہے کہ طیبات سے مراد وہ چیزیں ہوں جو طبیعت کو اچھی لگیں اور جن کو کھانے میں لذت کا فائدہ حاصل ہو۔ منافع میں اصل چیز حلت ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نفس کو پاکیزہ لگے اور طبیعت کو لذت دے، وہ حلال ہے اور ہر وہ چیز جو نفس کو ناپاک لگے اور طبیعت اس کو ناپسند کرے، وہ حرام ہے، سوائے اس کے کہ الگ سے کوئی دلیل ہو۔

...میں کہتا ہوں کہ خبائث سے مراد ہر وہ چیز ہے جو طبیعت کو ناپاک کرے اور نفس کو آلودہ کرے اور اس کو لینا تکلیف کا سبب بنے۔''

امام رازی نے یہی بات اپنی تفسیر میں ایک اور مقام پر قدرے مختلف الفاظ میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فلا يمكن ان يكون المراد بالطيبات ههنا المحلات، والّا لصار تقدير الآية: قل احل لكم المحلات، ومعلوم ان هذا ركيك، فوجب حمل الطيبات على المستلذ المشتهى، فصار التقدير:

''یہ ممکن نہیں ہے کہ یہاں طیبات سے مراد (اللہ تعالیٰ کی) حلال کردہ چیزیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ آیت اس طرح ہوتی: 'قل احل لكم المحلات' (کہہ دو تمھارے لیے حلال چیزیں حلال کی گئی ہیں) اور یہ معلوم ہے کہ یہ کمزور (جملہ) ہے۔ چنانچہ لازم

احل لکم کل ما یستلذ و یشتھی. ثم اعلم ان العبرة فی الاستلذاذ والاستطبة اھل المروءة والاخلاق الجمیلة، فان اھل البادیة یستطیبون اکل جمیع الحیوانات ویتاکد دلالة ھذہ الآیات بقولہ 'خلق لکم ما فی الارض جمیعا'. (تفسیر کبیر ۱۱/۱۴۲)

ہے کہ طیبات کو لذیذ اور پسندیدہ چیزوں پر محمول کیا جائے۔ لہٰذا جملے کا مفہوم یہ ہوگا: 'احل لکم ما یستلذ و یشتھی' (تمھارے لیے ہر لذیذ اور پسندیدہ چیز حلال کی گئی ہے)۔ پھر یہ جان لو کہ لذیذ ہونے اور پاکیزہ ہونے میں اچھے اخلاق والے لوگوں ہی کا اعتبار کیا جائے گا۔ کیونکہ اہل بادیہ تمام حیوانات کے کھانے کو پاکیزہ سمجھتے تھے۔ اور ان آیات کی دلالت کی تائید یہ آیت کرتی ہے کہ 'زمین میں جو کچھ ہے اس نے تمھارے لیے ہی پیدا کیا ہے'۔''

علامہ محمود آلوسی نے بیان کیا ہے:

ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث: فسر الأول بالاشیاء التی یستطیبھا الطبع کالشحوم، والثانی بالاشیاء التی یستخبثھا کالدم، فتکون الآیة دالة علی ان الاصل فی کل ما تستطیبہ النفس ویستلذہ الطبع الحل وفی کل ما تستخبثہ النفس ویکرھہ الطبع الحرمة الا لدلیل منفصل. (روح المعانی ۹/۸۱)

''ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث: پہلی چیز (یعنی طیبات) کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو طبیعت کو پاکیزہ لگیں جیسے چربی۔ اور دوسری چیز (یعنی خبائث) سے مراد وہ اشیا ہیں جو طبیعت کو ناپاک لگیں جیسے خون۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نفس کو پاکیزہ لگے اور طبیعت کو لذت دے، وہ حلال ہے اور ہر وہ چیز جو نفس کو ناپاک لگے اور طبیعت اس کو ناپسند کرے، وہ حرام ہے سوائے اس کے کہ الگ سے کوئی دلیل ہو۔''

صاحب ''معارف القرآن'' مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری، مفید اور پاکیزہ ہیں، وہ انسان کے لیے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ ... اب یہ بات کہ کون سی چیزیں طیبات یعنی صاف ستھری، مفید اور مرغوب ہیں اور کون سی خبائث یعنی گندی، مضر اور

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قابل نفرت ہیں، اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت ونفرت پر ہے۔'' (معارف القرآن ۳/ ۴۳)

صاحب ''تفہیم القرآن'' نے لکھا ہے کہ ہر چیز طیب ہے اور حلال ہے سوائے ان چیزوں کے جنھیں شریعت نے ناپاک اور حرام قرار دیا ہے اور جنھیں انسانی فطرت ناپاک تصور کرتی ہے:

''حلال کے لیے ''پاک'' کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس اباحت کی دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیا کے ''پاک'' ہونے کا تعین کس طرح ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصول شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں، یا جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت کرے، یا جنھیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔''

(تفہیم القرآن ۱/ ۴۴۴)

صاحب ''تفہیم القرآن'' نے اس موقع پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو مذہبیت کے زیر عنوان ہر چیز کو قانون کے زاویے سے دیکھتے اور اس کی حلت وحرمت کے تعین کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن نے اس موقع پر انھی لوگوں کی ذہنیت کی اصلاح کی ہے۔ مولانا کا یہ تبصرہ حسب ذیل ہے۔ فاضل تنقید نگار کے لیے اگر گراں باری خاطر نہ ہو تو وہ اس کی روشنی میں اپنے مقدمات کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں:

''مذہبی طرز خیال کے لوگ اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر وہمی پن اور قانونیت کا تسلط ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنوع تو نہیں۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انھیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے تا کہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل الٹ گیا۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے بجز اس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے بجز اس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حلت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کر کے ساری دنیا اس کے لیے حلال ہوگئی۔''

(تفہیم القرآن ۱/ ۴۴۴)

حلت وحرمت کے باب میں شریعت کے اسی بنیادی اصول کے تحت قرآن مجید نے بھی خبائث کا مصداق قرار پانے والی بعض چیزوں کی وضاحت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو متعین کیا ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کی بیان کردہ چار چیزوں کا تعلق ہے تو وہ ایک مخصوص دائرے میں حصر کے ساتھ بیان ہوئی ہیں اور ان پر اضافے کی کوئی گنجایش نہیں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مختلف جس دوسرے دائرے میں بعض جانوروں کی حرمت کو واضح کیا ہے، وہ چونکہ خبائث کی حرمت کے اسی عمومی اصول پر مبنی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اس لیے اسی اصول پر اگر انسان اپنی فطری ناپسندیدگی کی بنا پر بعض ایسی چیزوں پر حرمت کا حکم لگائیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ نہیں سنایا تو یہ کسی صورت میں دین کے خلاف متصور نہیں ہوگا، بلکہ بعینہٖ شارع کے بیان کردہ اصول پر عمل قرار پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ علما وفقہا نے جانوروں کی حلت وحرمت کے معاملے میں طیبات وخبائث ہی کو اصل الاصول قرار دیا ہے اور اس باب میں انسانی طبائع کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی ہی کو معیار مانتے ہوئے بہت سے ایسے جانوروں کو بھی حرمت کے دائرے میں شامل کیا ہے جن کی حرمت قرآن و حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ اس ضمن میں اگر کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے تو شارع کی طرف سے کوئی واضح صراحت میسر نہ ہونے کی بنا پر وہ اجتہادی اختلاف قرار پائے گا جس کی رخصت اور گنجایش خود صاحب شرع کی طرف سے رکھی گئی ہے۔

ذیل میں فقہ کے مختلف مکاتب فکر کے نمایندہ اصحاب علم کی آرا نقل کی جا رہی ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مطالعے سے ہماری بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

امام شافعی لکھتے ہیں:

فإن العرب كانت تحرم أشياء على أنها من الخبائث وتحل أشياء على أنها من الطيبات فأحلت لهم الطيبات عندهم إلا ما استثنى منها وحرمت عليهم الخبائث عندهم قال الله عز وجل ويحرم عليهم الخبائث... ولو ذهب ذاهب إلى أن يقول كل ما حرم

''اہل عرب بہت سی چیزوں کو ان کے خبیث ہونے کی وجہ سے حرام اور بہت سی چیزوں کو ان کے طیب ہونے کی وجہ سے حلال سمجھتے تھے، چنانچہ جن چیزوں کو وہ طیب سمجھتے تھے، ان میں سے بعض کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی کو ان کے لیے حلال قرار دیا گیا، اور جن چیزوں کو وہ خبیث سمجھتے تھے، وہ ان کے لیے حرام کر دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ رسول ان پر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حرام بعينه وما لم ينص بتحريم فهو حلال أحل أكل العذرة والدود وشرب البول لأن هذا لم ينص فيكون محرما ولكنه داخل فى معنى الخبائث التى حرموا فحرمت عليهم بتحريمهم... فلم تكن العرب تأكل كلبا ولا ذئبا ولا أسدا ولا نمرا وتأكل الضبع فالضبع حلال ... فجاءت السنة موافقة للقرآن بتحريم ما حرموا وإحلال ما أحلوا. (الام۲/۲۴۱)

خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔...اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ بس وہی چیز حرام ہے جس کو نام لے کر حرام کہا گیا ہو اور جس کی حرمت پر کوئی نص نہ ہو، وہ حلال ہے تو اسے پاخانہ اور (زخم سے نکلنے والے) کیڑوں کے کھانے اور پیشاب پینے کو حلال کہنا ہوگا، کیونکہ ان کے حرام ہونے پر کوئی نص نہیں، بلکہ یہ چیزیں 'خبائث' کے اندر شامل ہیں جنھیں اہل عرب حرام سمجھتے تھے اور ان کے حرام سمجھنے ہی کی وجہ سے (شریعت میں بھی) انھیں ان کے لیے حرام کہا گیا۔... پس اہل عرب کتے، بھیڑیے، شیر اور چیتے کا گوشت نہیں کھاتے تھے جبکہ بجو کا گوشت کھا لیتے تھے، اس لیے بجو حلال ہے۔ اسی طرح وہ چوہے، بچھو، سانپ، چیل اور کوے کو نہیں کھاتے تھے، پس سنت میں (جو بعض چیزوں کو حرام کہا گیا ہے) وہ قرآن کے اس حکم کے موافق ہے کہ اہل عرب جن چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں، وہ حلال اور جن کو حرام سمجھتے ہیں، وہ حرام ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علامہ کاسانی حنفی نے بیان کیا ہے:

ان الشرع انما جاء باحلال ما هو مستطاب فى الطبع لا بما هو مستخبث ولهذا لم يجعل المستخبث فى الطبع غذاء اليسر وانما جعل ما هو مستطاب بلغ فى الطيب غايته. (بدائع الصنائع ۵/۳۸)

''شریعت نے انھی چیزوں کو حلال کیا ہے جو انسانی طبع کے لیے خوش گوار ہیں، نہ کہ ان کو جن سے وہ گھن کھاتی ہے، اسی لیے فراوانی کی حالت میں اس چیز کو غذا نہیں بنایا گیا جو طبع کے لیے ناگوار ہو، بلکہ اس چیز کو غذا ٹھہرایا گیا ہے جو حد درجہ خوشگوار اور مرغوب ہے۔''

پانی کے بعض جانوروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

وقوله عز شانه ويحرم عليهم الخبائث

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ رسول ان پر خبیث

والضفدع والسرطان والحية ونحوها من الخبائث. (بدائع الصنائع ۳۵/۵)

چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے، اور مینڈک، کیکڑا اور سانپ وغیرہ بھی خبائث میں سے ہیں۔''

خشکی کے جانوروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

الذی یعیش فی البر فانواع ثلاثة ما لیس له دم اصلا وما لیس له دم سائل وما له دم سائل مثل الجراد والزنبور والذباب والعنکبوت والعضابة والخنفساء والبغاثة والعقرب ونحوها لا یحل اکله الا الجراد خاصة لانها من الخبائث لاستبعاد الطبائع السلیمة ایاها وقد قال اللّٰه تبارك وتعالیٰ ویحرم علیهم الخبائث ... کذلك ما لیس له دم سائل مثل الحیة والزغ وسام ابرص وجمیع الحشرات وهوام الارض من الفار والقراد والقنافذ والضب والیربوع وابن عرس ونحوها. (بدائع الصنائع ۳۶/۵)

''جو جانور خشکی پر رہتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں: کچھ وہ ہیں جن میں سرے سے خون نہیں، کچھ وہ ہیں جن میں بہنے والا خون نہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں بہنے والا خون ہے۔ (پس جن میں سرے سے خون نہیں) جیسا کہ ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑی، بغاثہ، گبریلا، پسو اور بچھو وغیرہ تو ان میں سے ٹڈی کے علاوہ باقی چیزوں کا کھانا حلال نہیں، کیونکہ یہ خبیث ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ سلیم طبیعتیں ان سے اجتناب کرتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ رسول ان پر خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔... اسی طرح وہ جانور بھی حرام ہیں جن میں بہنے والا خون نہیں، جیسے سانپ، چھپکلی کی مختلف قسمیں، کیڑے مکوڑے، زمین کے جانور مثلاً چوہا، چیچڑی، سیہی، گوہ، یربوع اور نیولا وغیرہ۔''

امام ابن قتیبہ نے لکھا ہے:

''بعض حرام چیزیں ایسی ہیں جن کی حرمت پر نہ قرآن میں کوئی آیت اتری ہے اور نہ سنت میں کوئی نص ہے۔ ان میں لوگوں کو ان کی فطرت پر اور اس طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے جن پر انھیں پیدا کیا گیا ہے، جیسے انسان کا گوشت، بندر کا گوشت، سانپ، چھپکلی کی مختلف قسمیں اور چوہا وغیرہ۔ ان میں سے ہر چیز سے نفوس گھن کھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں یہ اصول بتا دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں، اور یہ تمام چیزیں فطرت کی رو سے خبیث ہیں۔'' (تاویل مختلف الحدیث ۱۸۱)

ابن قدامہ حنبلی نے بیان کیا ہے:

وما عدا هذا فما استطابته العرب فهو حلال لقول الله تعالىٰ: (ويحل لهم الطيبات) يعني ما يستطيبونه دون الحلال ... وما استخبثته العرب فهو محرم لقول الله تعالىٰ (ويحرم عليهم الخبائث) ... اذا ثبت هذا فمن المستخبثات الحشرات كالديدان والجعلان وبنات وردان والخنافس والفار والاوزاغ والحرباء والعضاة والجراذين والعقارب والحيات.

(المغنی ۸/۵۸۵)

''ان جانوروں کے علاوہ جن جانوروں کو اہل عرب حلال سمجھتے ہوں، وہ حلال ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ رسول ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے، یعنی ان چیزوں کو جنھیں اہل عرب طیب سمجھتے ہیں۔...اور جن چیزوں کو اہل عرب خبیث سمجھتے ہوں، وہ حرام ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ رسول ان پر خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔...جب یہ ثابت ہو گیا تو خبیث سمجھی جانے والی چیزوں میں حشرات مثلاً کیڑے، گبریلے کی مختلف نسلیں، چھپکلی کی مختلف قسمیں، گرگٹ، مختلف قسم کے چوہے، بچھو اور سانپ وغیرہ شامل ہیں۔''

یہاں تک کہ ابن حزم کو بھی، جنھوں نے کسی بھی چیز کو خبیث قرار دینے کے لیے شارع کی طرف سے نص کو ضروری قرار دیا ہے (المحلیٰ ۸/۴۲) اور اپنی کتاب ''المحلیٰ'' میں مختلف جانوروں کی خباثت کے بارے میں پوری محنت سے نصوص جمع کرنے کی کوشش کی ہے، بعض جانوروں کے خبیث ہونے کے بارے میں انسانی فطرت اور رجحان ہی پر انحصار کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

وأما العقارب والحيات فما يمترى ذو فهم فى أنهن من أخبث الخبائث وقد قال تعالىٰ ويحرم عليهم الخبائث وأما الفيران فما زال جميع أهل الإسلام يتخذون لها القطاط والمصايد القتالة ويرمونها مقتولة على المزابل فلو كان أكلها حلالا لكان ذلك من المعاصى ومن إضاعة المال. (المحلیٰ ۷/۴۰۴)

''رہے بچھو اور سانپ تو کسی ذی فہم کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ خبیث ترین چیزیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ رسول ان پر خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں۔ جبکہ چوہوں کے شکار کے لیے تمام اہل اسلام بلیاں اور مہلک چوہے دان رکھتے رہے ہیں اور انھیں مارنے کے بعد انھیں کوڑا کرکٹ کی جگہوں پر پھینک دیتے ہیں۔ پس اگر ان کا کھانا حلال ہوتا تو مسلمانوں کا ایسا کرنا گناہ ہوتا اور مال کو ضائع کرنے کے زمرے میں آتا۔''

www.javedahmadghamidi.com

اس تفصیل سے واضح ہے کہ جناب جاوید احمد غامدی جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں طیبات اور خبائث کو بنیادی اصول قرار دیتے ہیں، البتہ ان کے مصداق کی تعیین کے ضمن میں، بعض فقہا کی رائے کے برعکس، منصوص جانوروں تک حرمت کو محدود رکھنے کے بجائے انسانوں کی فطرت سلیمہ اور ان کے ذوق اور مزاج کی روشنی میں ممانعت کے اس دائرے میں توسیع کے قائل ہیں اور ان کی یہ رائے جمہور فقہا کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ یہ وہ بحث ہے جس سے فاضل ناقد نے محض اپنے سوءفہم کی بنیاد پر درج ذیل مفروضات قائم کیے ہیں:

۱۔ غامدی صاحب فطرت انسانی کو شریعت سے الگ اور اس کے متوازی مستقل ماخذ دین قرار دیتے ہیں۔

۲۔ انھوں نے انسانی فطرت کو حلال وحرام کا اختیار تفویض کر کے اسے شارع بنا دیا ہے اور اس طرح نعوذ باللہ اسے اللہ کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

۳۔ انھوں نے ہر انسان کو تو حلال وحرام کا فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے، مگر نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اب اوپر کی سطور میں ہماری بحث کی روشنی میں ان الزامات اور مفروضات کا جائزہ لیجیے:

یہ بات درست ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن مجید نے ایک مخصوص دائرے میں جانوروں سے متعلق صرف چار چیزوں کو حرام ٹھیرایا ہے، جبکہ ان کے علاوہ باقی تمام چیزوں کی حلت وحرمت کا فیصلہ فطرت انسانی پر چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ فطرت کو حلت وحرمت کے باب میں مستقل بالذات ماخذ دین قرار دیا جا رہا ہے، کسی طرح درست نہیں ہے۔ یہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کے اختیار کا نہیں، بلکہ حلال وحرام کے باب میں شریعت کے بیان کردہ اصول یعنی طیبات اور خبائث کے مصداق کی تعیین کا مسئلہ ہے اور جمہور فقہا نے اس باب میں حلال اور حرام جانوروں کی فہرست تیار کرنے میں نصوص کے علاوہ انسانی فطرت سے بھی پوری پوری رہنمائی لی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ فطری علم کی روشنی میں طیبات وخبائث کی تعیین، تحلیل وتحریم کے زمرے میں آتی ہے اور یہ بات انسان کو شارع کے منصب پر فائز کرنے کے مترادف ہے، بدیہی طور پر سوءفہم ہے۔ یہ چیز اگر فطرت کے مستقل ماخذ دین قرار پانے یا انسان کے تحلیل وتحریم کے منصب پر فائز ہونے کو مستلزم ہے تو اس 'جرم' میں جمہور فقہا بھی غامدی صاحب کے ساتھ پوری طرح شریک ہیں۔

یہی کج فہمی اس الزام میں بھی کارفرما ہے کہ غامدی صاحب نے عام انسانوں کو تو حلال وحرام کا فیصلہ کرنے کا حق دے دیا ہے، مگر نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا حق تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جس دائرے میں قرآن نے چار چیزوں کی حرمت بیان کی ہے، اس پر اضافہ کوئی نہیں کر سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں ان محرمات میں کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ اس سے مختلف ایک دوسرے دائرے میں بعض جانوروں کی حرمت کو واضح کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کے ارشادات اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے جانوروں کی حرمت کے بارے میں فقہا کے فیصلے، دونوں خبائث کی حرمت کے اس اصول پر مبنی ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، لہٰذا قرآن کی بیان کردہ حرمتوں پر اضافے کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہ ماننے اور عام انسانوں کے لیے تسلیم کرنے کا اعتراض بالکل بے معنی ہے۔

فاضل ناقد نے سب سے بڑھ کر دل چسپ نکتہ جو پیدا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کو طیب و خبیث کے تعین کا اختیار دینے کے نتیجے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانوں کے مختلف گروہ اپنے اپنے فطری میلان کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف نتائج پر پہنچیں تو ان میں سے ترک و اختیار کا فیصلہ کس اصول کی بنا پر کیا جائے گا؟ فاضل ناقد نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی اس سوال کا ایک جواب وضع کیا ہے اور اسے جناب جاوید احمد غامدی کی نسبت سے بیان کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''غامدی صاحب کے نزدیک کھانے کے جانوروں میں انسانی فطرت سے حلال و حرام کا تعین ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف فطرت کی صورت میں کس کی فطرت معتبر ہوگی؟ ...غامدی صاحب اس مسئلے کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی کھانے کے جانور کے بارے میں انسانی فطرت کی آرا مختلف ہو جائیں تو جمہور کی رائے پر عمل کیا جائے گا۔ غامدی صاحب ''میزان'' (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی۔'' (میزان ۳۷)

غامدی صاحب کے اس سنہری اصول کی روشنی میں دنیا کے انسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے سؤر تک کو اپنی فطرت سے حلال کر رکھا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں ''المورد'' کا کوئی ریسرچ سکالر یہ تحقیق پیش کر دے کہ قرآن نے جس سؤر کو حرام قرار دیا ہے، وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا سؤر ہے، رہا آج کا سؤر جس کی مغرب میں باقاعدہ فارمنگ کی جاتی ہے، وہ فطرتاً حلال ہے۔ اہل مغرب کو تو چھوڑیے، مسلمانوں کو دیکھ لیں، ان کی اکثریت کے ہاں حلال و حرام کا کیا معیار ہے جسے غامدی صاحب اپنے اصول فطرت میں اختلاف کی صورت میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں؟'' (فکر غامدی ۲۲)

اسلوب تنقید کا یہ نادر نمونہ ارباب ذوق نے کم ہی ملاحظہ کیا ہوگا کہ کسی مصنف کی تحریر پر تنقیدی نکتہ اٹھایا جائے اور ازخود اس کا مفروضہ جواب وضع کر کے طنز وتعریض کی بوچھاڑ کر دی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ تنقید غامدی صاحب کی تحریر کو سمجھے بغیر لکھی گئی ہے، مگر اس مقام کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ سمجھنا تو دور کی بات ہے، یہ تو اس کو پڑھے بغیر ہی لکھی گئی ہے۔ غامدی صاحب کا یہ جملہ کہ ''دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی'' ان کی جس بحث سے اٹھایا گیا ہے، وہ ایک طویل اقتباس کی صورت میں ہم سابقہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ اس اقتباس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ پاکیزہ اور غیر پاکیزہ جانوروں کی تعیین کا فیصلہ جس دائرے میں انسانی فطرت پر چھوڑا گیا ہے، وہ بالکل الگ ہے، جبکہ قرآن مجید نے جن چیزوں کی حرمت کو قطعی طور پر بیان کر دیا ہے، وہ ایک بالکل الگ دائرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دائرے میں تو کسی حد تک انسانوں کے مابین اختلاف کی گنجایش موجود ہے اور فقہی اختلافات میں اور دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے انسانوں کے ہاں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن قرآن مجید کی حرام کردہ چیزوں کے دائرے میں اختلاف کی قطعاً کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس بحث میں سے سیاق وسباق کو کلی طور پر نظر انداز کر کے مذکورہ جملہ اٹھا لینا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قرآن مجید کی حرام کردہ چیزوں میں بھی انسانی فطرت اپنے تئیں فیصلہ کر سکتی ہے، علم وعقل، دیانت اور انصاف کا خون کیے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن فاضل ناقد کو داد دیجیے کہ وہ ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ یہ سب کچھ کر گزرے ہیں۔

بحث کے آخر میں فاضل ناقد نے ''غامدی صاحب کا اپنے اصولوں سے انحراف'' کی سرخی قائم کی ہے اور اس کی مثال کے طور پر ڈاڑھی کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا حوالہ دیا ہے اور یہ تضاد بیان کیا ہے کہ ایک جانب غامدی صاحب فطرت کو دین قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب ڈاڑھی جیسی فطری چیز کو دائرۂ دین میں شامل ہی نہیں کرتے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

> ''جس طرح غامدی صاحب کا اصول فطرت غلط ہے، اسی طرح بعض مقامات پر اس اصول کی تطبیق میں انھوں نے اپنے ہی وضع کردہ اس اصول سے انحراف بھی کیا ہے۔ ان میں سے ایک کو ہم قارئین کے لیے بطور مثال بیان کیے دیتے ہیں۔
>
> مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں ڈاڑھی بھی شامل ہے۔ کسی چیز کی فطرت سے مراد اس کی وہ اصل تخلیق ہے جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جس حالت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ بھی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے کہ ان کے چہرے پر ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں جبکہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ ہے کہ ان کے چہرے پر بال نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کی تخلیق میں یہ فطری فرق رکھا ہے۔ ڈاڑھی غامدی صاحب کے اصول فطرت سے ثابت ہے۔لیکن غامدی صاحب نے اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی اصول فطرت، دونوں کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے ڈاڑھی کو دین سے خارج قرار دیا ہے۔'' (فکر غامدی ۳۰)

اس مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فاضل ناقد 'فطرت' اور 'سنت' کے مفہوم اور ان کے الگ الگ دائروں کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔ وہ مقدمہ تو یہ قائم کر رہے ہیں کہ ''داڑھی غامدی صاحب کے اصول فطرت سے ثابت ہے'' اور اس سے نتیجہ یہ اخذ کر رہے ہیں کہ ڈاڑھی دین کا ایک حکم ہے اور پھر غامدی صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے ''اپنے اصول فطرت کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے داڑھی کو دین سے خارج قرار دیا ہے۔'' ڈاڑھی کے ایک فطری چیز ہونے سے غامدی صاحب نے ہرگز انکار نہیں کیا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اس فطری چیز کو شریعت نے باقاعدہ دینی رسم کی حیثیت دی ہے؟ چونکہ یہ بحث حقیقت میں ڈاڑھی کو فطرت تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے نہیں، بلکہ اس کو دینی مفہوم میں ایک 'سنت' قرار دینے سے متعلق ہے، اس لیے ہم اس حوالے سے اپنا موقف، ان شاء اللہ سنت کی بحث میں واضح کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

میرا نام

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

میرے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ والدہ کو ’’جاوید‘‘ پسند تھا۔ پیدایش کے بعد والد اپنے شیخ سے دعا کرانے کے لیے لے کر گئے تو انھوں نے فرمایا: اس کا نام ہم درویشوں کے طریقے پر ہونا چاہیے۔ اسے ’’کاکو شاہ‘‘ کہا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بادشاہ اس کے پاس نیاز مندانہ حاضر ہوں گے۔ میری چھوٹی خالہ برسوں والدہ کے پاس رہی تھیں۔ والد اور والدہ، دونوں ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے مجھ سے تین سال بڑے تھے جن کا نام انھوں نے ’’رفیق‘‘ رکھا تھا۔ اس کی مناسبت سے انھیں اصرار تھا کہ میرا نام ’’شفیق‘‘ رکھا جائے۔ وہ اس کے سوا کوئی دوسرا نام قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد بڑی خالہ دیکھنے کے لیے آئیں تو انھوں نے فرمایا: میں نے تو پہلے سے اس کا نام ’’کاکا محمد‘‘ رکھا ہوا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ میرے گھر والوں نے اس کا آسان حل یہ تلاش کیا کہ تمام نام قبول کر لیے۔ چنانچہ یہ بزرگ جب تک زندہ رہے، مجھے اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے رہے۔

مدرسہ میں داخلے کا وقت آیا تو والد موجود نہ تھے۔ اس زمانے میں بعض اوقات وہ مہینوں کے لیے اپنے شیخ کی خانقاہ کوٹلی مغلاں چلے جاتے تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست تھے جنھیں ہم چچا کہتے تھے۔ والد کی عدم موجودگی میں وہ مجھے داخل کرانے گئے۔ میرے لیے اسی اسکول کا انتخاب کیا گیا جس میں میرے خالہ زاد بھائی رفیق پڑھتے تھے۔ نام لکھاتے وقت چچا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سارے نام بتا دیے۔ وہ سخت پریشان ہوئے کہ اب فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ انھوں نے رفیق کی طرف دیکھا تو اس نے کہا: ہمارے گھر میں تو اسے ’’شفیق‘‘ ہی کہتے ہیں۔ چچا نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر یہی نام اسکول کے رجسٹر میں درج کرا دیا۔

میں جب شعور کی عمر کو پہنچا تو مجھے والدہ کا رکھا ہوا نام زیادہ پسند آیا۔ لیکن اب اسکول کے رجسٹر کا کیا کیا جائے؟ اپنے ایک استاد محمد صادق صاحب سے بات کی تو انھوں نے فرمایا: اس مرحلے پر نام تبدیل کرنا تو مشکل ہو گا۔ تمھیں شعر کہنے کا شوق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جاوید تخلص کر لو۔ میں تمھارا نام ''شفیق احمد جاوید'' لکھ دیتا ہوں۔ تمھیں ''شفیق'' پسند نہیں تو اپنا قلمی نام ''جاوید احمد'' بھی رکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ دوست احباب پہلے ہی ''جاوید'' کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ کالج کے زمانے سے اسی نام کی شہرت ہو گئی۔ بعد میں شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بنانے کا موقع آیا تو سب جگہ یہی نام لکھا گیا۔

میں غالباً نویں جماعت میں تھا کہ اپنے ایک پھوپھی زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور آیا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ دس پندرہ دن تک بڑے چچا محمد لطیف خان صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ انھیں اپنے والد اور میرے دادا نور الٰہی صاحب سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ رات دن وہ مجھے ان کے قصے سناتے اور بتاتے تھے کہ گاؤں میں تمھارے دادا ایک مصلح کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کی نیکی، خدا ترسی اور دانائی کی وجہ سے لوگ اپنے جھگڑے چکانے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کا ہر فیصلہ مان لیتے تھے۔ ان کی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ تاثر اتنا شدید تھا کہ میں ہر وقت دادا کے بارے میں سوچتا، یہاں تک کہ کئی دن تک سوتا تو خواب میں بھی انھی کو دیکھتا تھا۔

اس موقع پر خاندان کے ایک دوسرے بزرگ اور بچوں کے لیے دینی کتابوں کے مصنف مقبول انور صاحب داؤدی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی یہ نسبت ہمارے گاؤں ''داؤد'' کی وجہ سے تھی۔ میرے والد کا پورا نام بھی اگرچہ محمد طفیل جنیدی تھا، لیکن بعض اوقات کوئی چیز اچانک متوجہ کر لیتی ہے۔ داؤدی صاحب سے ملنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ میرے نام کے ساتھ بھی اس طرح کا کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔ لڑکپن میں ایسی خواہشیں بعض اوقات آدمی کے ذہن پر سوار ہو جاتی ہیں۔ میں بھی دن رات یہی سوچتا۔ ایک دن والد صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انھوں نے مقبول صاحب کی اتباع میں ''داؤدی'' کا اضافہ کر لینے کی تجویز دی۔ پھر فرمایا: ہمارے شیخ سے بیعت کر لیتے تو ''جنیدی'' بھی ہو سکتے تھے۔ ادھر میری خواہش تھی کہ یہ نسبت دادا سے ہو۔ چچا سے جو کچھ سن چکا تھا، اس کی بنا پر اب میرے لیے وہی آئیڈیل تھے۔ میں ان سے نسبت کے لیے سوچتا تو ''نوری'' اور ''مصلحی'' کے الفاظ ذہن میں آتے تھے، لیکن ذوق انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ دو بزرگ ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ والد کا معمول تھا کہ بارہا مہینوں کے لیے سیلانی فقیروں، اطبا اور سنیاسیوں کو اپنے ہاں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مہمان ٹھیرا لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اسی طرح آئے۔ ان میں سے ایک والد کے پیر بھائی غلام رسول وحشی اور دوسرے کوئی عالم اور سنیاسی تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔ وحشی بہت اچھے کاتب تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ کی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ وہ اسے سناتے اور اس کی شرح و وضاحت میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی دل چسپی عرب جاہلی کی تاریخ سے تھی۔ وہ اس کے واقعات والد کو سناتے تھے۔ میں ان بزرگوں کی مجلس میں گھنٹوں بیٹھتا اور بڑی دل چسپی کے ساتھ ان کی باتیں سنتا تھا۔ عبداللہ صاحب نے انھی مجلسوں میں کوئی قصہ سناتے ہوئے بیان کیا کہ بنو غامد کے ابوالآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر انھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا اور 'غمد الامر' کے الفاظ اس کے بعد عربی زبان میں 'اصلح الامر' کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ جزیرہ نماے عرب میں اسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے*۔ مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہی کام تو میرے دادا کرتے تھے۔ اس کے لیے یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بے حد مسرت ہوئی۔ والد سے ذکر ہوا تو انھوں نے بھی پسند کیا۔ میں ضلع ساہیوال کے جس دیہاتی ماحول میں رہتا تھا، وہاں اس طرح کا نام مذاق بن جاتا۔ اس لیے میں نے اسے لکھنا تو بہت بعد میں شروع کیا، لیکن اسی دن فیصلہ کر لیا کہ یہ لفظ اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بچپن، لڑکپن اور اوائل شباب کی خوشیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بعد میں سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس چیز نے علم و عمل اور فکر و خیال میں کیا اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دادا کے ساتھ نسبت کے لیے یہ لفظ مل جانے سے جو خوشی مجھے اس وقت ہوئی، اسے میں آج بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وقت کس طرح بدلتا ہے، اب بڑی سے بڑی بات بھی دل و دماغ میں اس طرح کا کوئی اہتزاز پیدا نہیں کرتی۔ ایسی سب چیزیں عمر کے ساتھ کس قدر بے معنی ہو جاتی ہیں:

ہر روز ایک تازہ جہاں کی حکایتیں
اب رہ گئی ہیں قصۂ عہد شباب میں

[۲۰۰۷ء]

---

* اس کے بعد لغت کی کتابیں دیکھیں تو اس کی تصدیق ہوئی۔ چنانچہ ''اقرب الموارد'' میں ہے: (غامدة) ابو قبيلة ينسب اليها الغامديون، وقيل: هو غامد واسمه عمرو ولقب به لاصلاحه امراً كان بين قومه۔